1991

فرحت جہاں

ایم اسلم

طبع اوّل   فروری ۱۹۴۴ء   قیمت عہ

سول ایجنٹس: نگارستان ایجنسی۔ دلی

فہرست

ادارۂ نسیم بک ڈپو لاہور نے مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس دلّی میں چھپوا کر شائع کی

فرحت جہاں

سبیتا کے ہاں کوئی تقریب تھی۔ ملنے جلنے والیوں کو مدعو کرنے کی گھر میں بات چیت ہو رہی تھی سبیتا کی چچیری بہنیں اور بڑی پیاری سہیلی کرشنا دونوں بیٹھی مہمانوں کی فہرست تیار کر رہی تھیں کئی ایک نام لکھے جا چکے تھے کرشنا بولی۔

"سبیتا! فرحت کا نام بھی تو لکھو۔ اسے کیوں بھول گئیں؟"

"بھولی تو نہیں" سبیتا نے جواب دیا "لیکن فرحت تو شاید نہ آ سکے"

"کیوں؟" کرشنا نے پوچھا "کیوں نہ آ سکے گی اب تو اپنے گھر والی ہو گئی"

۲

"اس کا شوہر کچھ پرانے خیال کا آدمی ہے"۔ سبیتا نے جواب دیا۔"اسے فرحت کا دوسروں سے ملنا جلنا پسند نہیں"

"لیکن!" کرشنا نے پوچھا"فرحت تو کہا کرتی تھی کہ وہ بہت تعلیم یافتہ آدمی ہے"۔

"بھاڑ میں جائے ایسی تعلیم" سبیتا نے کہا"جو دوسروں کی زندگی اجیرن کر دے"۔

"لیکن تم سے کس نے کہا؟" کرشنا نے پوچھا"فرحت سے ملے کئی دن ہوئے۔ فرحت تو بڑی اچھی سہیلی ہے"۔

"ڈوبی فرحت!" سبیتا نے ذرا مغموم آواز سے کہا"جتنی چنچل اور زندہ دل تھی اتنی ہی بپتا گلے پڑی بیچاری کے"۔

"لیکن تم سے کہا کس نے؟" کرشنا نے پوچھا۔

"کہتا کون" سبیتا نے جواب دیا۔"کیسے معلوم نہیں"

"مجھے تو معلوم نہیں"۔ کرشنا نے جواب دیا۔

"تمہیں گانے بجانے سے ہی فرصت نہیں۔ تم کیا جانو دنیا میں کیا ہو رہا ہے" سبیتا نے جواب دیا۔

"گانا بجانا کچھ پاپ تو نہیں" کرشنا نے کہا"ایک آرٹ ہے۔ مشق کرتی ہوں شاید کبھی کچھ حاصل ہو جائے"۔

۳

"بس کئے جا مشق!" سبیتا نے مسکرا کر کہا "کسی فلم کمپنی میں نوکری مل جائے گی۔ فلم سٹار بن جاؤ گی کسی روز"

"میں تو فلم کی نوکری پر تھوکتی بھی نہیں" کرشنا نے کہا۔

"تو پھر یہ گانے بجانے پر کیوں مری جاتی ہو" سبیتا نے پوچھا۔

کرشنا یہ سن کر مسکرا دی۔ اور سبیتا ذرا سر ہلا کر بولی۔

"اچھا!" سمجھ گئی۔

"کیا سمجھیں تم؟" کرشنا نے مسکرا کر پوچھا۔

"کہدوں؟" سبیتا نے ہنس کر پوچھا۔

"ہاں! کہدو!" کرشنا نے بھی ہنس کر کہا "کہو!"

"لچھمن!" سبیتا نے ہنس کر کہا "بوجھ لیا نا"

"لچھمن!" کرشنا نے ذرا سر ہلا کر کہا "یہ کیا بات ہوئی۔ کیا بوجھ لیا تم نے"

"اسے بھی تو گانے کا شوق ہے" سبیتا نے ہنس کر کہا۔ "بس گھر میں ہی ناٹک ہوا کرے گا۔ اور ہم بھی دیکھا کریں گے"

"اری چھوڑ!" کرشنا سبیتا کے ایک چٹکی لے کر بولی "یہ کتھا کیا لے بیٹھیں تم۔ لاؤ کاغذ دو مجھے۔ فرحت کو لکھوں"

"نہیں!" سبیتا نے جواب دیا "فرحت کو اگر لکھ کر پیغام بھیجا تو وہ ناراض ہو گی میں خود اس سے مل کر کہوں گی"

دونوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سبیتا کا بھائی پچھمن جس کی کرشنا سے بات ٹھہر چکی تھی آ گیا اور دونوں خاموش ہو گئیں۔

فرحت ایک اعلے گھرانے کی تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ بہت قبول صورت بڑی چنچل۔ بات بات پر ہنسی مذاق کرنے والی اور کچھ مغربی تہذیب اور تمدن کی دل دادہ بھی۔ جن دنوں وہ کالج میں تعلیم پاتی تھی سبیتا کماری سے اس کا اتنا میل جول تھا کہ دوسریوں کو رشک آتا۔ فرحت کی شادی بھی ایک بہت امیر گھرانے میں ہوئی۔ اس کا شوہر میر شبیر حسین بھی خاصہ تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔

شبیر حسین کوٹھی میں رہتے تھے۔ نوکر چاکر۔ موٹر۔ ریڈیو۔ سبھی کچھ موجود تھا۔ گھر میں فرحت کا حکم چلتا تھا۔ کوئی معاملہ اس کی مرضی کے خلاف نہ ہونے پاتا۔ لیکن میر شبیر حسین پرانے رسم و رواج کی طرف زیادہ مائل تھا۔ فرحت جس ماحول میں پلی اور پل کر جوان ہوئی وہ سسرال سے بالکل مختلف تھا۔

آزادانہ عورتوں کے جلسوں میں شامل ہونا۔ کالج کی ڈرمیٹک پارٹی میں حصہ لینا۔ کالج گرلز کے ساتھ پک نک کے لئے شہر سے باہر موزوں مقامات پر جانا۔ تیرنے کی مشق کرنا۔ مہینے میں دو چار بار سینما دیکھنا یہ اس کے عام مشاغل تھے۔ لیکن شادی ہوتے ہی اسے ان مشاغل سے اس طرح علیحدہ ہونا پڑا گویا مذہباً یہ سب باتیں ایک مسلمان عورت کے لئے حرام ہیں۔ سسرال میں عمدہ سے عمدہ لباس پہننا بھی منع نہ تھا۔ سہیلیوں کو گھر پر بلاکر دل بہلانا بھی ممنوع نہ تھا پردے کا پورا خیال رکھتے ہوئے موٹر میں بیٹھ کر سیر و تفریح کے لئے گھر سے باہر جانے پر بھی روک نہ تھی لیکن یہاں نماز اور روزے کے بھی چرچے تھے شبیر خود بھی نمازی تھا۔ اور وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی بھی ہر نقطۂ نظر سے ایک مسلمان بیوی بن کر رہے۔ اور اسی بات پر دونوں میں آئے دن اختلاف رہتا۔ لیکن ایسا اختلاف نہیں جس سے بے لطفی پیدا ہو کر شکررنجی بڑھے بس اسی قدر ادھر بات ہوئی ادھر رفت گذشت!

لیکن ایک روز کچھ بات بڑھ ہی گئی۔ قصہ یوں ہوا کہ زنانہ کلب میں قوم کی سیاسی ترقی اور پردہ کے موضوع پر کچھ

تقریریں کرنے کا انتظام کیا گیا اور فرحت کو بھی اس مباحثہ میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔ فرحت ان ایام میں دو چار روز کے لئے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس نے اس خیال سے کہ عورتوں ہی کا تو جلسہ ہے بحث میں شامل ہونے کی حامی بھر لی۔ اب جو سسرال واپس آکر مضمون تیار کرنے لگی تو شبیر نے ایک روز ہنس کر پوچھا۔

"فرحت! یہ کیا دن بھر لکھ لکھ کر کاٹتی رہتی ہو تم؟ کسی رسالے کے لئے کوئی مضمون لکھا جا رہا ہے کیا؟"

فرحت نے جو کچھ لکھا تھا اس پر طبیعت کچھ جمتی نہ تھی مشکل یہ تھی کہ اگر کھلم کھلا پردے کی مذمت کرے تو اور نہیں کم از کم سسرال والوں کی لتاڑ کا خوف تھا اور جو حمایت کرے تو لڑکیوں کے اس ترقی پسند گروہ کی دل شکنی کا خیال تھا جو آنے والی بحث میں فرحت سے بہت زیادہ امیدیں باندھے بیٹھی تھیں فرحت شوہر کی طرف دیکھ کر بولی۔

"جس گھر میں مضمون نویسی بھی شرعاً ناجائز ہو وہاں کوئی مضمون کیسے لکھ سکتا ہے"

شبیر بولا۔" جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے تو کبھی

مضمون لکھنے سے تمہیں منع نہیں کیا ہاں! یہ عورتوں کے قلم سے مجھے حسن و الفت کی بیہودہ کہانیاں اور عاشقانہ غزلیں پسند نہیں اور تم خود بھی کئی بار تسلیم کر چکی ہو کہ اکثر لکھنے والیوں کے یہاں عریانی بھی اب جگہ پا رہی ہے اور جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ادب میں عریانی قابل معافی نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟" فرحت نے پوچھا "یا ایسے ڈھونس جمانے کو دعوے بے دلیل ہی ہے۔"

"بحث تو بعد میں ہوتی رہے گی۔" شبیر نے مسکرا کر کہا "لیکن ڈھونس کون جما رہا ہے۔"

"یہ ڈھونس جمانا نہیں تو اور کیا ہے۔" فرحت نے ذرا بگڑ کر جواب دیا۔ "کہ آپ ایک آرٹ کو ملعون کر رہے ہیں۔ یا عریانی کو آرٹ ماننا بھی آپ کے یہاں شرعاً ناجائز ہے۔"

شبیر مسکرا کر بولا۔

"ہر ایسی چیز کو جس سے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہو۔ تمدن پر بُرا اثر پڑتا ہو۔ تہذیب پر بُرا اثر پڑتا ہو۔ میں کیا ایک دنیا ناجائز قرار دے گی۔ رہا یہ سوال کہ عریاں نویسی ادب میں آرٹ کا رتبہ رکھتی ہے یا نہیں تو اس میں مجھے اختلاف ہے۔"

"یعنی!" فرحت نے جواب دیا۔ "عریاں نویسی کوئی ادبی کمال نہیں۔ یہی مطلب ہے نا آپ کا؟"

"ہاں! یہی مطلب!" شبیر نے جواب دیا۔

فرحت سر ہلا کر بولی

"اور یہ جو یورپ کے اکثر اہل قلم کے افسانوں میں جو عریانی پائی جاتی ہے۔ ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے"

"میں ہندوستانی ادب کے متعلق تم سے بحث کر رہا ہوں"

شبیر نے کہا۔ "یورپ والوں کی بات رہنے دو"

"کیوں رہنے دوں؟" فرحت نے پوچھا۔ "یہ آپ کے ہندوستان کے اکثر اہل قلم اس کے ساتھ چلتے یا یہ بھی کہہ لیجئے کہ موجودہ دور کے اہلِ قلم بھی تو یورپ والوں ہی کے خوشہ چیں ہیں"

"مان لیتا ہوں" شبیر نے جواب دیا۔ "کہ تمہارا استدلال ٹھیک ہے لیکن تمہیں یہ بھی تو معلوم ہے کہ ہم لوگوں کی اہل مغرب سے ہر چیز جدا ہے۔ ہم لوگ چونکہ غلام ہیں اس لئے حکمراں کی نقالی بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے یہہ سوچنے سمجھنے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کی۔ کہ ہمارے تمدن۔

تہذیب اور روایات پر اس نقالی سے کچھ برا اثر تو نہیں پڑتا
اور جو تم مجھ سے پوچھو تو میں تو یہ ڈنکے کی چوٹ پر کہہ دوں کہ اس
نقالی سے نہ تو ہمارا بھرم ہی رہا ہے اور نہ وقار"

"کون لے گیا آپ کے بھرم اور وقار کو؟ فرحت نے پوچھا

"مغرب کی اندھی تقلید!" شبیر نے جواب دیا

"یورپ کی تقلید کا رونا مت روئیے" فرحت بولی "بلکہ اپنی
تنگ نظری کا ماتم کیجیے۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کیا خوب فرما گئے
ہیں کہ ؎

واعظِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

ہر قوم میں اچھی چیزیں بھی ہوتی ہیں اور بری بھی۔ لیکن کسی
کی کوئی اچھی چیز لے لینا نقالی نہیں کہلاتا۔ اس سے کچھ فائدہ
ہی ہوتا ہے انسان ہاتھ سے کچھ کھو نہیں دیتا۔ طبیعت میں
صلاحیت کا مادہ ہو تو انسان اقوام عالم میں وقار کی نگاہ
سے دیکھا جاتا ہے۔ اور جو تنگ نظری کی عینک چڑھا رکھی
ہو تو دوسروں کا تو ذکر ہی کیا خود اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو جاتا
ہے۔"

"فرحت" شبیر بولا "بحث کا یوں مزا نہیں کہ ایک حصّہ ختم نہ ہو اور دوسرا شروع کر دیا جائے۔"

"آپ کو کسی بات پر قیام ہو تو کوئی بحث بھی کرے" فرحت نے جواب دیا۔ "آپ کے یہاں تو میل چھوٹی رہتی ہے۔ ذرا سی دیر کو کہیں رکی اور پھر چلدی۔"

"اجی واہ!" شبیر نے ہنس کر کہا۔ "لتاڑ کے انداز کوئی آپ ہی سے سیکھے"

پھر بیوی کی ٹھوڑی ہلا کر۔

اسے کہتے ہیں ع "بجلی گرائی جاتی ہے ترچھی نگاہ سے"

اور فرحت شوہر کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

"جب کسی بات کا جواب بن نہ پڑے تو سبھی یونہی بغلیں جھانکا کرتے ہیں۔"

اور شبیر ہنس کر بولا

"بیوی کے تعلیم یافتہ ہونے میں سب سے زیادہ لطف بھی تو یہی ہے کہ کسی موضوع پہ بات چیت کرنے کا مزا آجاتا ہے۔"

اور فرحت نے شوہر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"تو آپ نے اسی خیال سے مجھ سے شادی کی تھی"

"تو نہیں کہا؟" شبیر نے ہنس کر کہا "وہ حضرت اکبر کا شعر سنا نہیں کرے

میں بھی گریجو یٹ ہوں تو بھی گریجویٹ
علمی مباحثے ہوں ذرا پاس آکے لیٹ

"ہے نا ٹھیک؟"

"ٹھیک ہے یا غلط یہ تو آپ ہی جانیں" فرحت نے جواب دیا "لیکن یہ فرمایئے اس شعر میں کہیں عریانی تو نہیں"

"بالکل نہیں" شبیر نے کہا "میاں کا بیوی سے یہ کہہ دینا کہ بھئی! ذرا یہاں آکر لیٹ جاؤ۔ عریانی کیسے ہو گیا؟"

"عملاً نہ سہی!" فرحت نے جواب دیا "لیکن الفاظ سے تو عریانی کا اظہار ہوتا ہے۔ یا آپ کو اس سے بھی انکار ہے؟"

"فرحت!" شبیر بولا "اگر تم عریانی کو آرٹ کہنے پر مصر ہو تو اکبر مرحوم کے اس شعر میں بقول تمہارے جو عریانی ہے تو میں الفاظ کی اس عریانی کو شاعر کے آرٹ کا کمال کہوں گا"

"شکریہ" فرحت نے ذرا طنزاً کہا "آپ نے مان تو

کیا کہ ادب میں عریانی بھی ایک آرٹ ہے لیکن......"
"لیکن!" شبیر نے بات کاٹ کر کہا "وہ عریانی نہیں جو میں آج کل کے اکثر افسانہ نگاروں کے یہاں دیکھتا ہوں۔
فرحت! تم خود ہی ذرا انصاف سے کہدو کہ اس دور کے دو چار نوجوان افسانہ نگاروں کے یہاں جو عریانی پائی جاتی ہے وہ قبیح ترین فحش نگاری ہے یا نہیں پھر ستم تو یہ ہے کہ ان لوگوں کی دیکھا دیکھی تمہاری ہی ایک بہن بھی اسی گندی رو میں بہے چلی جا رہی ہے۔ کتنا افسوس ہے کہ ان لکھنے والوں کو اتنی شرم بھی نہیں کہ ان کے افسانے پڑھنے والیوں میں ان کی اپنی ماں بہنیں بھی تو ہوں گی۔ تم نے ابھی ابھی کہا تھا کہ یورپ والوں کے یہاں عریاں نویسی ایک آرٹ ہے۔ اور مجھے بھی اس سے انکار نہیں۔ لیکن افسوس صرف اتنا ہے کہ تم نے یورپ کے عریاں نویسوں کا اپنے یہاں کے عریاں نویسوں سے کبھی مقابلہ ہی نہیں کیا۔ یورپ والوں کے ہاں تو واقعی یہ آرٹ ہے۔ لیکن جب اس آرٹ کی طرف ہمارے ہندوستانی افسانہ نگار متوجہ ہوئے تو ان اللہ کے بندوں نے اسے فحش نگاری کا رنگ دے کر رسوائے عام کر دیا۔ ہمارے ان

افسانہ نگاروں کی تو وہ بات ہے کہ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا" اور اس کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ ہمارے یہاں تحریر کی یہ عریانی نہ تو آرٹ کہلا سکتی ہے اور نہ خوبی بلکہ لکھنے والے کی سرشت کی آئینہ دار ہے۔ یعنی سہ

زخم آپ لیتا ہوں لذتیں اٹھاتا ہوں
تجھ کو یاد کرتا ہوں درد کے بہانے سے

"لیکن!" فرحت نے پہلی بار مسکرا کر کہا "چٹخارے لے کر تو آپ بھی پڑھتے ہوں گے"

"دو چار افسانے پڑھے تو ضرور ہیں" شبیر نے جواب دیا "لیکن یقین مانو اتنی گھن آئی کہ کچھ پوچھو نہیں"

"تو گویا" فرحت بولی "آپ حسن و عشق کی داستانوں کو ناپسند فرماتے ہیں"

"یہ میں نے کب کہا؟" شبیر نے پوچھا "میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ مجھے عورتوں کی تحریر میں حسن و عشق کے لغو اور بیہودہ چرچے پسند نہیں۔ خدا نے تمہیں علم بھی دیا ہے اور تمہیں لکھنے کا سلیقہ بھی ہے کیا اچھا ہو جو تم ان مضمون نگار عورتوں کی اصلاح کے لئے قلم اٹھاؤ۔ اس کام میں جتنا

ہو سکے گا میں بھی تمہارا ہاتھ بٹاؤں گا۔ کہو! کیا صلاح ہے لیکن تم یہ آج کل لکھ کیا رہی ہو"

فرحت ذرا مسکرا کر بولی

"لیڈیز کلب نے" قوم کی سیاسی ترقی اور پردے کے موضوع پر ایک بزم مباحثہ منعقد کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اور اس میں مجھے بھی مدعو کیا ہے۔ اسی کے لئے کچھ سوچ رہی ہوں"

"موضوع تو بہت اچھا ہے" شبیر نے کہا "گویا اسلامی نقطۂ نگاہ سے بحث کی جائے گی۔ تمہارا کیا خیال ہے"

"میرے خیال میں تو پردہ قوم کی سیاسی ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے" فرحت نے جواب دیا۔

شبیر نے بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"استغفر اللہ! چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!"

اور فرحت ذرا تیوری چڑھا کر بولی۔

" میں کفر اور اسلام کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتی۔ ایک سیاسی بات آپ کے سامنے ہے اس کے متعلق جو کچھ کہنا ہو کہئے!"

"فرحت!" شبیر بولا "ہم مسلمانوں کی سیاست مذہب سے ہے اور خدا اور رسول صلعم کے احکام کسی طرح نظر انداز نہیں کئے جا سکتے"

"تو پھر بحث بھی ختم ہے" فرحت نے روکھے پن سے کہا۔

"بحث ختم کیسے ہو گئی" شبیر نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

"تو اور کیا؟" فرحت نے کہا "جب آپ نے یہ کہہ دیا کہ مسلمانوں کی سیاست مذہب سے ہے تو اب آپ ہی فرمایئے کہ کوئی بحث کیسے کرے۔ میرے خیال میں تو مسلمانوں پر وہ دور کبھی نہیں گذرا جس میں مذہب کا تازیانہ ان کی راہ نمائی کے لئے ہر وقت موجود رہا ہو"

"استغفر اللہ!" شبیر ذرا مسکرا کر بولا "فرحت بخدا میں تمہیں مذہب سے اتنا کورا ہرگز نہ سمجھتا تھا۔ اور نہیں تو کم از کم مسلمانوں کی جہانبانی کی تاریخ ہی پڑھ ڈالو"

"کیا لکھا ہے اس تاریخ میں؟" فرحت نے پوچھا

"یہی!" شبیر نے جواب دیا "کہ مسلمانوں کی سیاست بھی مذہب سے ہے۔ علامہ اقبالؔ مرحوم کا وہ شعر نہیں سنا تم نے کہ ؎

کی۔ کبھی کسی مندر، شوالے یا گرجے کو منہدم نہیں کیا شہریوں کے رسم و رواج میں کبھی رد و بدل کرنے کا حکم نہیں دیا حکومت میں وہ ہمیشہ شریک رہے ہیں۔ ہاں! ان رسموں اور دستوروں کو ضرور روکا ہے جس میں ظلم اور جبر کا پہلو نکلتا ہو۔ جیسے اسلام نے دختر کشی کو روکا۔ اور انگریزوں نے اس ملک میں آکر ستی کی رسم کو جرم قرار دیا۔ خیر! یہ تو ہوا لیکن قوموں کی سیاسی ترقی میں پردہ حارج کیسے ہوا۔"

"جیسے اس ملک میں ہو رہا ہے؟" فرحت نے جواب دیا

"کیا ہو رہا ہے اس ملک میں؟" شبیر نے پوچھا

"مسلمان عورتیں اپنے مردوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتیں" فرحت نے جواب دیا۔

"تم یہ کہو!" شبیر نے ہنس کر کہا "کہ مسلمان عورت اتنی سہل انگار اور آرام طلب ہو گئی ہے کہ وہ مدد کرنا چاہتی ہی نہیں"

"یہ تو آپ نے غلط کہا؟" فرحت نے جواب دیا۔ "وہ تو مدد کے لئے بھی اور خدمت کے لئے بھی ہر وقت تیار ہے"

"تو روکتا کون ہے؟" شبیر نے پوچھا

"یہی آپ کا پردہ اور کون؟" فرحت نے جواب دیا۔

"لیکن!" شبیر نے کہا" یہ پردہ تو کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ تو اسلام کی ابتدا ہی سے رائج ہے۔ اور دختران اسلام مذہبی لڑائیوں میں اپنے مردوں کے ساتھ اکثر شامل ہوتی رہی ہیں اور اپنی بساط کے مطابق مسلمانوں کی مدد بھی اور خدمت بھی کرتی رہی ہیں۔

"اس وقت عورت کو گھر کی چار دیواری میں بند رہنے کا حکم نہ تھا" فرحت نے کہا" اس زمانے میں عورت کو پردے میں اس طرح نہیں رکھا جاتا جس طرح ہمارے باورچی نے اپنی بٹیروں کو بستنی میں بند کر رکھا ہے۔ اس وقت مسلمان عورت کو جینے کا حق تھا۔ لیکن آج آپ نے اس سے یہ حق چھین لیا ہے۔ آج ہمارے مرد ایک کام کرنے کا اعلان کرتے ہیں لیکن ہم مسلمان عورتیں ان کے دوش بدوش کھڑے ہو کر ان کی شریک کار نہیں ہو سکتیں۔ اس طرح قوم کی آدھی قوت تو کام کرتی ہے اور آدھی قوت بے کار رہتی ہے ادھر دوسری قومیں ہیں۔ انہیں جو کام کرنا ہوتا ہے اس میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ گویا دو طاقتیں مل کر کام کرتی ہیں۔ تو اب اس سے آپ ہی اندازہ لگا لیجئے

کہ جہاں دو طاقتیں مل کر کام کریں ان کی جیت ہوگی یا جہاں
ایک ہی طاقت کام کر رہی ہو۔ دور مت جائیے آپ! ذرا
کانگریس اور مسلم لیگ ہی کی طرف دیکھئے آپ کانگریس کو
ہمیشہ بنیوں کا گروہ کہا کرتے ہیں۔ لیکن ذرا خدا لگتی کہئے کہ
اس گروہ کی عورتوں نے اپنے مردوں کا کس کس طرح ہاتھ بٹایا
ہے۔ اور اپنے ملک اور قوم کی خاطر کیسی کیسی قربانیاں دی
ہیں۔ جیلوں میں گئیں ہیں۔ ڈنڈے ان پر پڑے ہیں صعوبتیں
انہوں نے جھیلی ہیں۔ گھروں کا آرام بچوں کی محبت۔ سکھ چین
جب ضرورت پڑی ہے قوم اور ملک پر بھینٹ چڑھا دیا ہے
اب رہی آپ کی مسلم لیگ تو وہی "جگ جگ جی پیر نبی جی!
اللہ میاں روزی بھیجیو۔ ایک تو آپ خواب غفلت سے
بیدار ہی اس وقت ہوئے جب ساتھی بہت دور نکل چکے
تھے۔ اور جب میدان میں آئے بھی تو اپنی عورتوں کا شامل
ہونا آپ کو کبھی گوارا نہ ہوا۔ اب آپ کے سر پر پاکستان کا
بھوت سوار ہو رہا ہے"

"بھوت!" شبیر نے جو خاموش بیٹھا بڑے تعجب سے
بیوی کی باتیں سن رہا تھا ذرا چونک کر کہا"

"بھوت نہیں تو اور کیا؟" فرحت نے جواب دیا۔ "اور جو بھوت کے نام سے آپ کو چڑ ہے تو چلئے اسے سودا ہی کہہ لیجئے۔ لیکن یاد رکھئے یہ سودا بھی اس وقت تک سودائے خام ہی رہے گا جب تک آپ ہم لوگوں کو اپنا ہاتھ بٹانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ پاکستان حاصل کر لینا تو کچھ مشکل نہیں۔ مشکل تو صرف یہ ہے کہ یہاں بھی ایک ہی قوت کام کر رہی ہے اور دوسری قوت کو آپ نے بے کار سمجھ کر گھر میں بند کر رکھا ہے۔ جب تک یہ طاقت میدان میں نہیں آئے گی تب تک کامیابی آپ کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ آپ بڑے ناز اور فخر سے ہمیں دخترانِ اسلام تو کہتے ہیں لیکن کتنا افسوس ہے کہ آپ ان دخترانِ اسلام کو اپنے جوہر دکھلانے کا کبھی کوئی موقع نہیں دیتے۔ اگر اسلام کے ابتدائی زمانے میں ہم دختران اسلام مذہبی لڑائیوں میں آپ کا ہاتھ بٹاتی رہی ہیں تو آج ہم میں ایسے کون سے کیڑے پڑ گئے جو عضوِ معطل سمجھ کر ہمیں گھروں میں بٹھا دیا گیا ہے۔ ہے آپ کے پاس اس کا کوئی جواب؟ آپ جواب کیا دیں گے۔ اس کا جواب بھی بندی ہی سے لیجئے! عرض کروں؟"

"کیا؟" شبیر نے پوچھا "کہئے؟"
فرحت ہنس کر بولی
"ایک تو آپ کو ہم پر اعتماد نہیں۔ دوسرے اس رسمی پردے کا بھوت آپ کے سر پر کچھ ایسا سوار ہے کہ آپ اسے مذہب کا رنگ دیئے بیٹھے ہیں۔ بس! میں اس بحث میں اب زیادہ نہیں پڑوں گی آپ ہی خدا لگتی کہہ دیجئے کہ قوم کی سیاسی ترقی میں پردہ حارج ہے یا نہیں"
"بالکل نہیں" شبیر نے ایک لانبا سانس لے کر کہا۔
"ہاں! ایک چیز سے مجھے بہت خوشی حاصل ہوئی ہے۔"
"کس چیز سے؟" فرحت نے میاں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کہئے!"
شبیر نے بیوی کا نرم اور نازک ہاتھ جس کی سبک اور پتلی پتلی انگلیوں میں جواہر نگار انگوٹھیاں چمک رہی تھیں اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔
"مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی ہے کہ میری فرحت جہاں، ماشاء اللہ تقریر خوب کر سکتی ہے! اب رہا تمہارے اعتراضات کا جواب تو جناب جس طرح میں نے توجہ سے

آپ کی تقریر سنی ہے آپ بھی اب ہماری دو چار باتیں غور سے سن لیں۔ تم کو یہ شکایت ہے کہ ہم لوگ آپ کو گھر کی چار دیواری کے اندر بند رکھتے ہیں۔ اور آپ نے اسے رسمی پردے کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ اعتراض بالکل درست ہے اس قسم کا پردہ واقعی ایک رسمی پردہ ہی ہے۔ لیکن تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ ہمیں اس رسمی پردے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ مرد کو کس چیز نے مجبور کیا کہ وہ عورت کو گھر کی چار دیواری میں بند رکھے۔ یہ اعتراض کرنے سے پہلے تمہیں یہ دیکھ لینا چاہیئے تھا کہ ہندوستان کے ہم مسلمان کس فضا میں زندگی کا سانس لے رہے ہیں۔ اور ہماری ہمسایہ قومیں رسم و رواج عادات و اطوار۔ تمدن اور تہذیب کے نقطۂ نظر سے ہم سے کہاں تک مختلف ہیں۔ فرحت! معاف کرنا مجھے یہ بہت افسوس ہے کہ تم نے صرف تعلیم ہی حاصل کی ہے۔ لیکن تعلیم سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اب تم خود ہی انصاف سے کہہ دو کہ ان اختلافات کے ہوتے ہوئے مسلمان کس طرح ان لوگوں سے گھل مل کر رہ سکتے تھے۔ انسان ننگ و ناموس کی خاطر جان پر کھیل جاتا ہے۔ متاع عزیز قربان کر دیتا ہے

ہندوستان کی معاشرت۔ یہاں کا تمدن یہاں کے رسم ورواج ان سب کا تقاضہ یہی تھا کہ ہر قوم کی اپنی اپنی ڈگر ہو۔ مسلمانوں نے عزت اور ننگ و ناموس کے تحفظ کی خاطر اپنی عورتوں کو گھروں سے باہر نکلنے سے منع کر دیا۔ عورت کے لئے پردہ کرنا تو خدا اور رسول صلعم کا حکم ہے۔ اس حکم کی تعمیل بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے ہمارا فرض ہے۔ ہاں! ہم اس بات کے گنہگار ضرور ہیں کہ ہم نے پردے کے معاملے میں ذرا سی سختی برتی ہے۔ اور یہ سختی کیوں کی۔ اس کی وجہ میں تم سے ابھی ابھی کہہ چکا ہوں۔ دوسرا اعتراض تم نے یہ کیا ہے کہ مسلمان جب کوئی کام کرنے کا بیڑہ اٹھاتے ہیں تو اس کام میں عورتوں کو شامل نہیں کرتے۔ اس کے لئے مثال تم نے کانگرس کی دی ہے مجھے اس سے تو انکار نہیں کہ کانگرس سیاست کے میدان میں ہم سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اسے حاصل کیا ہوا۔ کیا ملک کو آزادی مل گئی۔ کیا حکومت کے بڑے بڑے محکموں پر ہندوستانی افسر مقرر کئے گئے۔ خاک بھی نہیں ہوا ہاں! کانگرس کو مسلمانوں کا گلا کاٹنے کے لئے مختلف صوبوں میں وزارتیں قائم کرنے کا موقع ضرور مل گیا۔ اور کانگرسی وزیروں

نے بھی مسلمانوں پر ظلم و ستم کر کے دل کی بھڑاس اچھی طرح
نکال لی۔ تم یقین مانو کانگرس کا یہ مقصد نہ پہلے تھا اور نہ آج
ہے کہ انگریز بوریا بستر سنبھال کر اس ملک سے چلے جائیں
کانگرسی تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ لاٹھی انگریز کی ہو اور راج
کانگریس کرے اور جیسے بھی بن آئے مسلمانوں کو تختۂ مشق
بنائے۔ رہی یہ بات کہ ہندو قوم کی بیٹیاں بھی اپنے مردوں
کے دوش بدوش سرگرم عمل ہیں تو یہ تو کوئی ایسی بات نہیں
جس پر ناز کیا جائے۔ ہندو کو چونکہ اپنے دست و بازو پر بھروسہ
نہیں اور اس کے علاوہ شور و غوغا کے سوا اس کے سیاسی
پروگرام میں اور کوئی چیز شامل نہیں اس لئے محض اکثریت کے
اظہار کے لئے یہ لوگ اپنی عورتوں کو بھی ساتھ لے نکلتے ہیں
لیکن ایک مسلمان کی حالت اس سے بالکل علیحدہ ہے اسے
اپنے دست و بازو پر پورا بھروسہ ہے۔ چونکہ وہ مسلمان ہے
اس لئے اسے یہ بھی یقین ہے کہ وہ غیر مسلموں سے دب کر
نہیں رہ سکتا۔ اس لئے وہ جنس لطیف کو ایسے کاموں میں
جہاں کسی وقت اسے اپنا خون بھی بہانا پڑے شامل کرنا
گوارا نہیں کرتا مرد کے گھر کی زینت عورت سے ہے۔ وہ

اس کے امور خانہ داری کی مشیر اعظم ہے خانہ داری کے امور اسی کے صلاح مشورہ سے طے پاتے ہیں۔ وہ مرد کے بچوں کو پرورش کرنے والی ایک مادر مہربان ہے۔ اس لئے ایسی ہمدرد اور غم گسار کو مصیبت میں ڈالنا دُونِ ہمتی کہلائے گا۔ اگر ایک مرد کے گھر کو گلستاں سے تشبیہہ دی جائے تو اس گلستاں میں عورت ایک ایسا خوبصورت اور حسین پھول ہے جس کے دم سے تمام گلستاں رشکِ ارم بنا رہتا ہے تھکے ماندے مردوں کی دل داری عورت اپنی میٹھی زبان سے کرتی ہے۔ دکھیارے اور مصیبت زدہ مردوں کی غم گساری، محبت اور درد سے کرتی ہے۔ فقیر کا گھر ہو یا امیر کا محل دونوں میں عورت کے دم قدم سے رونق اور برکت نظر آتی ہے۔ اب کتنا ستم ہے اگر کوئی ایسی متاع عزیز کو کانٹوں میں لئے پھرے۔ مسلمان تو اپنی عورت کی عزّت اور عصمت کی قسم کھاتے ہیں اور تم چاہتی ہو کہ دوسری قوموں کی طرح تم بھی بازاروں اور شاہراہوں پر اودھم مچاتی پھرو۔ افسوس ہے۔ تم نے مثال بھی دی تو کن لوگوں کی دی۔ علامہ اقبال کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اب رہی "مسلم لیگ" تو مسلم لیگ غریب کو تم جس طرح چاہو کوسنے دے لو۔ لیکن ذرا اپنے مسلمان بھائیوں کی اس مجرمانہ غفلت اور مسلم لیگ سے لاپرواہی پر بھی تو ایک نظر ڈالو۔ مسلم لیگ کو مسلمانوں نے ترقی دینے کی کوشش ہی کب کی۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے ہمارے اچھے اچھے لائق اور سیاستدان مسلمان سب کانگرس کی جے پکارتے تھے لیکن جوں جوں وہاں دھکے ملے پھر اپنے اصلی مرکز کی طرف لوٹنے لگے۔ اور جانتے ہو یہ اصل مرکز کیا ہے۔ وہی مسلم لیگ اور آج بھی دیکھ لو کہ حضرت ابوالکلام آزاد ایسا عالم مسلمان ابھی تک گاندھی کے دروازے پر جاروب کشی کر رہا ہے کہنے کو تو حضرت کانگرس کے پریزیڈنٹ ہیں۔ لیکن حال یہ ہے کہ اگر وائسرائے سے ملاقات کے لئے جائیں تو پنڈت جواہر لال نہرو ضرور ساتھ ہوں گے۔ کہنے والے جو چاہیں کہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کانگرسی ہندوؤں کو مولٰنا آزاد پر بھی اعتماد نہیں۔ اگر یہ لوگ آج سے بہت مدت پہلے مسلم لیگ

کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوتے تو خدا کی قسم! ہندوستانی
کو سیاسی آزادی کبھی کی مل گئی ہوتی۔
آخر میں تم نے "پاکستان" کی تجویز کو "بھوت" کا لقب دیدیا
ہے۔ اور تمہارا خیال ہے کہ تم عورتوں کی مدد کے بغیر یہ چیز
ہمیں حاصل نہیں ہو سکتی۔ تو جناب! جس طرح آپ کا پردہ
اور نسوانی طاقت کے متعلق خیال غلط ہے۔ اسی طرح آپ
کا یہ نظریہ بھی تم غور کرو تو تمہیں معلوم ہو کہ ہندوستان میں ہندو
اور مسلمانوں کے سیاسی اختلاف کا صرف ایک ہی علاج
ہے اور وہ پاکستان ہے۔ اور میں تم سے یہ بھی کہے دیتا
ہوں کہ پاکستان حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کو کچھ قربانیاں
بھی ضرور کرنی ہوں گی۔ لیکن تم دیکھ لو گی کہ تم پردہ نشینوں
کی مدد کے بغیر ہی انشاء اللہ یہ مہم بھی ہم لوگ سر کریں گے
اب رہا تمہارا آخری اعتراض کہ جب دختران اسلام کفر و
اسلام کی لڑائیوں میں مسلمانوں کا ہاتھ بٹاتی رہی ہیں تو اب
وہ کیوں خاموش رہیں۔ گھبراؤ نہیں فرصت! اگر کسی روز پھر
وہی کفر و ایمان کے معرکے کہیں شروع ہو گئے تو پھر انشاء اللہ
تم مردوں کے دوش بدوش اسی طرح نظر آؤ گی جس طرح زمانۂ

سلف میں تمہاری بہنیں نظر آیا کرتی تھیں"
فرحت بولی
"خدا وہ دن بھی کبھی کرے"!
"وہ تو تب ہو گا جب خدا کو منظور ہو گا"، شبیر نے ہنس کر کہا "لیکن دیکھو تو تمہارا مضمون تو تیار ہو گیا"!
"ہاں!" فرحت نے بھی مسکرا کر کہا "کچھ ڈال دیا ہو ہی گیا ہے۔ خدا کرے وقت پر پڑھا ٹھیک جائے!"
"تمہاری کوئی سہیلی تمہاری طرف سے پڑھ دے گی" شبیر نے کہا
"میری سہیلی پڑھ دے گی۔ کیوں؟" فرحت نے تعجب سے پوچھا "میں خود کیوں نہ پڑھوں؟"
"تم جلسے میں جا کر پڑھو گی؟" شبیر نے تعجب سے پوچھا
"ہاں!" فرحت نے جواب دیا "عورتوں ہی کا تو جلسہ ہے"
"ٹھیک ہے!" شبیر بولا "لیکن مجھے تو تمہارا وہاں جانا پسند نہیں"
"کیوں؟" فرحت نے ذرا تیوری چڑھا کر پوچھا "کیا آپ

یہ چاہتے ہیں کہ میں عورتوں سے بھی پردہ کیا کروں"
"میں نے کب کہا کہ تم عورتوں سے پردہ کیا کرو" شبیر نے جواب دیا "میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے تمہارا لیڈیز کلب میں جانا پسند نہیں"

"وہاں کوئی کھیل تماشہ تو نہیں" فرحت بولی "ایک علمی ادبی مجلس ہے۔ ان کے اصرار پر میں نے بھی حامی بھر لی ہے"

"حامی بھر لی تو پھر ہوا کیا!" شبیر نے جواب دیا "مضمون لکھ کر بھیج دو۔ کوئی اور پڑھ دے گی"

"مگر میں خود کیوں نہ جاؤں؟" فرحت نے کہا "آخران بندشوں کی کوئی وجہ بھی ہونی چاہیئے"

"بندش کیسی؟" شبیر نے کہا "ایک بات مجھے پسند نہیں وہ میں نے تم سے کہدی ہے"

"لیکن ناپسندیدگی کی کوئی وجہ بھی آخر؟" فرحت نے پوچھا

"وجہ پوچھتی ہو" شبیر بولا "تو سنو۔ لیڈیز کلب میں کچھ ایسی عورتیں بھی شامل ہیں کہ ان کے رنگ ڈھنگ مسلمانوں کے لئے باعث ذلت ہیں"

"یعنی وہ پردہ نہیں کرتیں" فرحت نے کہا

"ہاں!" شبیر بولا "وہ صرف پردہ ہی نہیں کرتیں بلکہ اخلاقی طور پر بھی وہ بہت گری ہوئی ہیں"

"تو ہمیں اس سے کیا؟" فرحت بولی "یہ ضروری نہیں کہ ہم ان سے گھل مل کر رہیں"

"اور یہ بھی ضروری نہیں" شبیر نے جواب دیا "کہ ہم ایسی بدلگام عورتوں کی سوسائٹی میں شامل ہوں"

"عجب منطق ہے یہ بھی!" فرحت نے کہا "کہ کلب میں چونکہ کچھ آزاد خیال عورتیں بھی آتی ہیں اس لئے کلب میں جانا ہی نہیں چاہیئے۔ عورتیں ہی تو ہیں۔ کوئی متعدی مرض تو نہیں"

"بہت خوفناک متعدی مرض!" شبیر نے جواب دیا۔

"بہت اچھا!" فرحت نے کہا "میں ان سے بات چیت ہی نہ کروں گی"

"لیکن تم وہاں جاؤ ہی کیوں؟" شبیر بولا "انسان کو کچھ وضعداری کا خیال بھی تو رکھنا چاہیئے۔ کچھ خاندان کی عزت کا بھی پاس ہونا چاہیئے۔ ہمارے خاندان کی عورتیں آج تک کسی کلب میں نہیں گئیں"

فرحت مسکرا کر بولی

"یہ بھی تو ساتھ کہئے کہ وہ تعلیم یافتہ بھی نہیں"

"شریف تو ہیں" شبیر نے کہا "انہیں اپنی اور اپنے خاندان کی عزت کا تو پاس ہے"

"جی ہاں!" فرحت نے ذرا ناک سکیڑ کر کہا "آپ ہی کے خاندان کی مستورات صرف شریف ہیں۔ اور ان کے سوا اور کسی کو تو اپنے خاندان کی عزت کا پاس ہی نہیں۔ چہ خوب!"

"تو اس میں شک ہے کیا؟" شبیر نے کہا "جسے خاندان کی عزت کا پاس ہو اسے ایسی عورتوں سے ملنا جلنا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ پھر بلا وجہ کوئی کسی سے ملے کیوں؟"

"لیکن میں تو کسی سے ملنے نہیں جا رہی!" فرحت نے کہا "مجھے تو ایک بحث میں شریک ہونے کے لئے کہا گیا ہے"

"لیکن؟" شبیر نے پوچھا "میری اجازت بغیر تم نے حامی کیوں بھر لی"

"کوئی رنڈی کا ناچ دیکھنے تو نہیں جانا تھا!" فرحت نے ذرا چمک کر کہا "جو آپ سے پہلے پوچھ لیتی"

"لیکن!" شبیر بولا "میں تمہارا مجازی خدا تو ہوں۔ تمہارا فرض ہے کہ کوئی کام میرے مشورہ اور میری اجازت بغیر مت کرو"

"جی ہاں!" فرحت بولی "آپ میرے مجازی خدا تو ہیں لیکن بحیثیت بیوی کے میرے بھی آپ پر کچھ حقوق ہیں۔ جب سے میں بیاہی آئی ہوں" ہر بات پر ٹوک ہو رہی ہے حیران ہوں کہ آپ نے ابھی تک یہ حکم کیوں نہیں دیدیا کہ میں اپنے والدین سے بھی نہ ملا کروں"

"اور اگر میں یہ حکم دیدوں" شبیر نے کہا "تو تمہیں وہ بھی ماننا ہوگا"

"کیا یہ بھی اسلام کا حکم ہے" فرحت نے طنزاً پوچھا

شبیر بولا

"اسلام کا حکم ہے کہ بیوی ہر کام میں شوہر کی تابعداری کرے ہاں اگر وہ کفر کرنے کو کہے تو انکار کر دے"

فرحت بولی

"مجھے اگر یہ معلوم ہوتا کہ آپ اتنے تنگ خیال ہیں تو کبھی اس جنجال میں نہ پڑتی"

اور مجھ سے اگر یہ نہ کہا گیا ہوتا کہ فرحت جہاں بیگم کے دل میں اسلام کی بہت محبت ہے تو شاید میں بھی اس مصیبت میں نہ پڑتا" شبیر نے بھی ذرا غصے سے کہا میں ہر طرح سے ڈھیل دیئے

جا رہا ہوں۔ لیکن تم نے اپنے طرزِ عمل میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ ذرا دل میں سوچو تو کون سے شوق ہیں تمہارے جو یہاں پورے نہیں ہو رہے۔ کون سا کام ہے جو تمہاری مرضی کے خلاف ہوتا ہے۔ میرے والدین تمہاری کسی بات میں دخل نہیں دیتے۔ وہ تو گھر بار سب تمہارے سپرد کر چکے لیکن تم نے کبھی کبھی انہیں خوش کرنے کی کوشش کی"

"تو کیا؟" فرحت نے غصے سے کہا "میں ان کا گھر بار لٹا رہی ہوں"

"گھر بار تو تم کیا لٹاؤ گی" لیکن تمہاری حرکات سے انہیں دکھ بہت ہوتا ہے"

"میں کوئی شریف زادی تھوڑی ہوں جو میری حرکات انہیں پسند ہوں" فرحت نے جھلا کر کہا "آپ کوئی شریف زادی لے آئیے جو ان کا اور آپ کا دل ٹھنڈا ہو"

"تم تو خواہ مخواہ بگڑ رہی ہو" شبیر نے کہا "چلو! چھوڑو یہ قصہ"

"قصہ کیسے چھوڑوں" فرحت بولی "آخر مجھے معلوم تو ہو میری کون سی بات ہے جو آپ کے والدین کو پسند نہیں"

"کہدوں ؟" شبیر نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں ! ہاں !!" فرحت بولی۔ کہہ دیجئے۔ تاکہ مجھے معلوم تو ہو
کہ مجھ سے کون سا ایسا گناہ سرزد ہو رہا ہے جو آپ کے والدین
مجھ سے ناراض ہیں"
شبیر بولا
"فرحت ! انہیں امید تھی کہ ان کی بہو پابند صوم وصلوٰۃ ہو گی"
فرحت شوہر کی طرف دیکھ کر بولی
"یہ پہلے معلوم کیوں نہ کر لیا آپ نے !
"غلطی ہوئی !" شبیر نے جواب دیا
"تو پھر شکایت کیسی ؟ فرحت نے پوچھا
"لیکن مجھے شکایت کرنے کا حق تو ہے" شبیر نے کہا
"اور تمہارا فرض ہے کہ میری شکایت رفع کرو"
"خدا سے کہئے !" فرحت نے غصّے سے کہا
"لیکن تم نے کیا قسم کھا رکھی ہے کہ تم نماز روزہ کا کبھی نام نہ
لو گی" شبیر نے کہا
"توبہ ہے !" فرحت بولی "نماز روزے کے سوا اور کوئی
گویا انسان کو کام ہی نہیں"

"لیڈیز کلب میں جانا تو کام ہے نا" شبیر نے کہا

"وہاں تو میں جاؤں گی ہی" فرحت نے جواب دیا

"نہیں!" شبیر بولا "میں تمہیں اجازت نہیں دے سکتا"

"میں اس قسم کے جکڑ بند کب تک برداشت کرسکوں گی"

فرحت بولی "اس کا آج ہی فیصلہ ہو جانا چاہیئے"

"فیصلہ کیسا؟" شبیر نے جواب دیا "تم میری بیوی ہو اور میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ تمہیں میری خواہشات کا پورا پورا احترام کرنا ہوگا۔ ورنہ ...."

"ورنہ کیا؟" فرحت نے بھی غصّے سے کہا "رک کیوں گئے؟"

"تمہیں معلوم نہیں" شبیر نے پوچھا

"نہیں! فرحت نے جواب دیا

"تو نتیجہ اچھا نہ ہوگا" شبیر نے جواب دیا

"یہ تو مجھے پہلے سے نظر آ رہا ہے" فرحت نے کہا "کہ اگر آپ کی سختیاں یوں ہی رہیں تو شاید میری اس گھر میں گذر نہ ہو سکے گی"

"فرحت!" شبیر غصّے سے بولا "ذرا سوچو تو تم کیا کہہ رہی ہو"

لیکن فرحت نے کچھ جواب نہ دیا اور پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔

کھانے کا وقت آیا تو ماما نے آ کر کہا

"بی بی جی! کھانا تیار ہے"

"مجھے بھوک نہیں!" فرحت نے جواب دیا

"بیگم صاحبہ سے کیا کہوں" ماما نے پوچھا

"تمہیں بھیجا کس نے ہے؟" فرحت نے پوچھا

"بیگم صاحبہ نے!" ماما نے جواب دیا۔ میاں اور بیگم صاحبہ (فرحت کی ساس) کھانے والے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں"

"کہہ دو!" فرحت بولی "میرے سر میں درد ہے میں آج کھانا نہیں کھاؤں گی"

ماما نے فرحت کی ساس سے جو گھر میں بیگم صاحبہ کہلاتی تھیں جا کر کہہ دیا کہ بی بی جی کے سر میں درد ہے وہ اس وقت کھانا نہیں کھائیں گی

"کب سے درد ہے" شبیر کی ماں نے پوچھا

"یہ تو جناب میں نے پوچھا نہیں" ماما نے جواب دیا

پاس سے شبیر بولا

"درد کا کیا ہے ہو گیا کسی وقت!"

شبیر کی ماں نے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا

"لیکن ہو کیوں؟ کچھ وجہ بھی تو ہونی چاہیئے۔ تم نے بھی نہیں پوچھا"

"اب میں ذراسی بات بھی پوچھا کروں" شبیر نے ذرا غصے سے کہا "ہو رہا تو جاتا بھی رہے گا۔"

"کہیں فرحت سے تم نے تو کچھ نہیں کہا" ماں نے پوچھا

"گویا" شبیر بولا "مجھے اپنی بیوی سے کچھ کہنے کا حق ہی نہیں۔ یہ اچھی رہی"

ماں نے بیٹے کی طرف تعجب سے دیکھا اور بولی

"یہ آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ صبح تو فرحت بالکل اچھی تھی۔ تم ہی نے کچھ کہا ہو گا"

کرسی سے اٹھ کر۔

"ٹھہرو تو میں خود جا کر پوچھتی ہوں"

"اماں!" شبیر بولا "کیا پوچھو گی تم۔ تمہاری بہو کے سر پہ آزادی کا بھوت سوار ہے"

"سمجھی!" شبیر کی ماں بولی "تم نے سینما جانے سے روکا ہوگا"

"چلو!" شبیر بولا "یوں ہی سہی۔ شریف زادیاں ایسی جگہ کیوں جائیں جہاں شہر بھر کے لچے لفنگے بھی جمع ہوں"

"لیکن مردوں کے ساتھ ہوتے ہوئے شریف زادیاں بھی سیر و تفریح کی جگہ جا سکتی ہیں" ماں نے جواب دیا

"لیکن مجھے یہ پسند نہیں" شبیر نے کہا "میں اس قسم کی اجازت نہیں دے سکتا"

"اجازت؟" ماں نے تعجب سے کہا

"ہاں!" شبیر بولا "میری بیوی کو میرا حکم ماننا ہوگا"

"تم کون ہو حکم دینے والے" ماں نے بگڑ کر پوچھا "فرحت تو بڑی منجھی ہوئی طبیعت کی لڑکی ہے۔ میرے تو گھر کی رونق ہی اس کے دم سے ہے"

"بس!" شبیر نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا "آپ کی ایسی ہی باتوں نے تو اسے سر چڑھا رکھا ہے"

"یہ آج تم کہہ کیا رہے ہو" ماں نے ماتھے پر بل ڈال کر

پوچھا۔

"میں وہی کہہ رہا ہوں" شبیر نے جواب دیا۔ "جس کی اسلام اور شریعت مجھے اجازت دیتی ہے"

"واہ!" ماں نے ذرا طنزاً کہا۔ "چار روز سید صاحب کے پاس کیا بیٹھے بڑے متقی اور پرہیزگار بن گئے"

ماما پاس چپکی کھڑی تھی۔ کہنے لگی

"تو کھانا لے آؤں میں؟"

"ٹھہرو!" شبیر کی ماں بولی۔ "میں فرحت کو لے آؤں پھر کھانا لانا۔"

لیکن شبیر ماما کی طرف دیکھ کر بولا۔

جاؤ! تم کھانا لاؤ۔ جسے کھانا ہوگا خود کھائے گا۔ مجھے تو بھوک لگ رہی ہے"

اور شبیر کی ماں نے کہا

"شبیر کو کھلا دو۔ میرا اور فرحت کا رہنے دو"

فرحت پلنگڑی پر لیٹی ہوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔ ساس کو دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ساس نے پاس بیٹھ کر کہا۔

"فرحت! یہ کیا ستم ہے کہ سر میں درد ہو رہا ہو۔ اور تم کتاب پکڑے بیٹھی ہو؟"

"ایسے ہی لے بیٹھی تھی" فرحت نے جواب دیا

"کب سے درد ہو رہا ہے" ساس نے پوچھا؟ "مجھ سے کیوں نہ کہا!"

"جاتا رہے گا خود ہی" فرحت نے آہستہ سے کہا

"سر درد کی ٹکیہ کھالی ہوتی" ساس بولی

فرحت چپکی ہو رہی۔ ساس نے پوچھا

"تمہیں آج سینما جانا ہے؟"

"نہیں!" فرحت بولی "آپ سے کس نے کہا؟"

"نہیں!" ساس بولی "مجھ سے تو کسی نے نہیں کہا" میں نے ایسے ہی خیال کیا کہ شاید شبیر نے روکا ہو"

"وہ مالک ہیں!" فرحت نے کہا "لونڈی کی کیا مجال ہے جو سرتابی کرے"

"لونڈی!" ساس نے تعجب سے پوچھا "کیا کہہ رہی ہو تم فرحت؟ کیا بات ہے بیٹی! مجھ سے نہ کہو گی"

"کچھ بات نہیں" یہ کہنے کے ساتھ ہی فرحت کی آنکھوں

میں آنسو بھر آئے"

"ہائیں!" ساس نے تعجب سے کہا "یہ کیا؟ تم تو رونے لگیں رؤ نہیں بیٹی۔ روئیں تیرے دشمن۔ لیکن کچھ بتا تو سہی بات کیا ہے"

"کچھ نہیں" فرحت نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا"

"بیٹی!" ساس سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "میں تمہاری ماں ہوں۔ میں نے تو گھر بار تمہارے سپرد کر رکھا ہے پھر بھی اگر کوئی بات تمہاری مرضی کے خلاف ہو تو مجھے تو بتا دینی چاہیئے"

"کوئی بات ہو تو بتاؤں بھی" فرحت نے جواب دیا

"معلوم ہوتا ہے" ساس بولی "اس پگلے نے کچھ کہا ہوگا"

"وہ مالک ہیں" فرحت بولی "جو چاہیں کہیں لونڈی کا کیا ہے جس طرح کوئی چاہے دھونس جمالے"

"دھونس جمانے والے کی ایسی تیسی"، ساس نے پیار دلاسا دیتے ہوئے کہا "پوچھ لیتی ہوں ابھی اس سے بھی۔ چلو! اٹھو کھانا کھاؤ چل کر۔ اٹھو میری رانی۔ تھوک دو غصے

کو۔ ذرا تمہارے ابّا (فرحت کے خسر) آجائیں سب کس بل نکل جائیں گے اس پگلے کے"

تو خیر اس طرح ساس دم دلاسا دے کر فرحت کو کھانے والے کمرے میں لے آئی۔ فرحت کو دیکھتے ہی شبیر صاحب نے منہ پُھلا لیا۔ ساس کے دو چار بار کہنے سے فرحت بھی کھانے بیٹھ گئی۔

*

جب کھانا کھا چکے تو ماما نے کچھ پھل لا کر رکھ دیئے۔ اب ماں نے بیٹے سے کہا

"شبیر! سچ سچ کہہ دو۔ کیا کہا تھا آج تم نے فرحت سے میں نے؟" شبیر بولا "کچھ بھی نہیں"

"کچھ کیسے نہیں" ماں نے کہا "کچھ تو کہا ہے تم نے"

"میں نے تو کچھ نہیں کہا" شبیر نے جواب دیا "کوئی خود بخود ناراض ہو جائے تو اس کا میں کیا علاج کر سکتا ہوں"

"خود بخود کوئی کیسے ناراض ہو سکتا ہے" ماں نے پوچھا

"یہ اپنی بہو سے پوچھ لیجئے!" شبیر نے کہا

"دیکھو بھائی!" ماں بولی "میری فرحت سے کوئی کچھ نہ کہا کرے

تمہیں اگر کچھ شکایت ہو تو مجھ سے کہو۔ میں خود سمجھا دیا کروں گی"

"شکایت تو مجھے ہے" شبیر نے پھل کاٹتے ہوئے کہا۔ اور غالباً آپ کو بھی"

"مجھے؟" ماں نے تعجب سے پوچھا "کیا؟"

"اماں!" شبیر بولا "اب انجان کیوں بننے لگیں تم۔ کئی بار تو تم مجھ سے فرحت کی شکایت کر چکی ہو"

"میں تم سے شکایت کر چکی ہوں" ماں نے تعجب سے کہا "کہیں بھنگ تو نہیں پی آئے تم؟"

"ابھی کل ہی تو تم نے مجھ سے کہا تھا کہ فرحت نماز کی طرف سے بہت غافل رہتی ہے" شبیر نے جواب دیا

"ہاں!" ماں بولی "کہا تو تھا۔ لیکن تمہیں اس سے کیا؟ لیکن میں نے شکایتاً تو نہیں کہا تھا"

"آپ نے شکایتاً کہا ہو یا نہ کہا ہو۔ لیکن مجھے خود یہ بہت ناگوار ہے" شبیر نے کہا۔ میں ہزار بار خود کہہ چکا ہوں۔ لیکن یہاں کوئی سنتا ہی نہیں۔ انگریزی مدرسوں میں تعلیم پانے میں سب سے بڑی قباحت بھی تو یہی ہے کہ خدا رسول کا

دل میں احترام رہتا ہی نہیں"

"تمہیں اس سے کیا؟" ماں نے کہا "تم کوئی خدائی فوجدار تو ہو نہیں"

"لیکن فرحت میری بیوی تو ہے" شبیر نے جواب دیا "کیا اس کا یہ فرض نہیں کہ میرے حکم کی تعمیل کرے"

"میں بیوی ہوں" اب فرحت بولی "باندی نہیں آپ میرے اعمال کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن یہ ہر بات میں دھونس مجھ سے برداشت نہ ہوگی"

"یہ پہلے سوچ لینا تھا" شبیر نے جواب دیا

"اب بھی کچھ بگڑا نہیں" فرحت نے بھی ذرا غصے سے کہا

"تو کیا طلاق لو گی" شبیر نے بھی غصے سے کہا

اے چپ رہو!" ماں نے کہا "ایسی بات شریفوں کے منہ سے زیب نہیں دیتی۔

فرحت بولی

"یہ مجھے شریف زادی سمجھتے ہی کب ہیں۔ آئے دن مجھے اسی طرح دھمکیاں دی جاتی ہیں میں لاوارث نہیں جو روا اور ناروا دونوں سہے جاؤں"

"بیوی ہو کر تو سب سہنا پڑے گا" شبیر نے کہا

"دیکھا جائے گا" فرحت نے کہا

ماں بولی

"آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو؟"

شبیر بولا

"آپ کی بہو رانی کلب میں لیکچر دینے جانا چاہتی ہیں۔ میں نے روکا تو مفت کا جھگڑا لے بیٹھیں۔ شریف زادیوں کی تو کوئی پرچھائیاں بھی نہیں دیکھ سکتا"

"اور میں تو بازاروں میں چکر لگاتی پھرتی ہوں" فرحت نے کہا

"جب گھر سے نکلیں تو پھر بازار ہو یا کلب ایک ہی بات ہے" شبیر نے کہا

"تو قید میں بھی نہیں رہ سکتی" فرحت نے کہا

"اور کسی شتر بے مہار کی طرح گھومنے کی بھی میں اجازت نہیں دے سکتا" شبیر نے جواب دیا

شبیر کی ماں بولی

"آج تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے۔ چلو چھوڑو یہ قصہ!"

"اماں!" فرحت نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا: "اس روز روز کے قصّے سے تو میرا سینہ پک گیا ہے۔ اچھا ہے۔ آج فیصلہ ہی ہو جائے۔ طلاق کا نام تو انہوں نے لے لیا اب باقی کیا رہا"

"اس کی تو مت ماری ہے بیٹی!" ساس نے کہا: "بکنے دو اسے۔ چلو اٹھو آرام کرو جاکر"

"قیدن کے لئے آرام کہاں؟" فرحت نے روتے ہوئے کہا۔

"قیدی ہوں تمہارے دشمن!" ساس نے پیار سے پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "تم اس گھر کی مالک ہو۔ مجال نہیں کسی کی جو کوئی تمہارے سامنے آنکھ بھی اٹھائے"

شبیر جھنجھلا کر بولا

"بس ایسی ہی باتوں سے تو اماں تم نے اسے سر چڑھا رکھا ہے"

"چپ رہو تم!" ماں نے بیٹے کو ڈانٹ کر کہا: "تم اپنے اصول اپنے پاس رہنے دو۔ تمہاری کمائی نہیں کھاتی جو تم یوں دھونس جمانے لگے آج۔ لڑکی ہے آخر۔ اگر سہیلیوں

"اس کی بات تو پھمن سے طے ہو گئی"

"تمہارے بھائی سے" فرحت نے مسکرا کر کہا "ارے وہ تو پہلوان ہے۔ پس جائے گی بے چاری"

اس پر کرشنا نے فرحت کے چٹکی لی

فرحت نے پوچھا

"اب بیاہ کب ہو گا"

"دسہرے کے تہوار کی چھٹیوں میں" سبیتا نے جواب دیا

فرحت نے پوچھا

"کرشنا ہنی مون کہاں مناؤ گی"؟

"تم نے کہاں منایا تھا" کرشنا نے ہنس کر پوچھا "ارادے تو تمہارے بھی بڑے بڑے تھے"

"ارادوں سے کیا ہوتا ہے" فرحت نے جواب دیا "پلّے ہی مولوی پڑا ہے"

"شکل صورت سے تو ظاہر نہیں ہوتے" کرشنا نے کہا

اور سبیتا نے پوچھا

"لیکن تم نے اتنی روک تھام کیسے گوارا کر لی"

"تو کیا؟" فرحت نے کہا "ماں کے دوارے جا بیٹھوں"

کرشنا بولی

"ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور"

"قسمت کی بات ہے" فرحت نے کہا

کرشنا بولی

"یہی تو اس ملک میں ایک قباحت ہے کہ لڑکی لڑکے کو شادی کے معاملے میں دخل نہیں دینے دیا جاتا"

اور سبینا نے ہنس کر کہا

"لیکن تمہیں تو اس کی شکایت نہیں۔ جانے تم دونوں نے کب سے آپس میں قول و قرار کر رکھے تھے"

کرشنا بولی

"مجھے کیا پڑی تھی کہ میں کسی سے قول و قرار کرتی۔ تمہارا بھائی ہی جونک بنا پھرتا ہے"

اور فرحت نے ہنس کر کہا

"خون میٹھا ہو تو جونک بھی چمٹتی ہے"

سبینا بولی

"اب تو یہ تان سین ہو گئی۔ دن بھر گانے بجانے کی مشق ہوتی ہے"

فرحت نے کہا

"پچھمن بھائی کو بھی تو گانے کا شوق ہے"

"اسی لئے تو میں کہتی ہوں" سبیتا نے کہا "گھر میں ہی ناٹک ہوا کرے گا"

اور فرحت نے آہ بھر کر کہا

"سبیتا تم خوش قسمت ہو۔ سہیلی بھاوج بن گئی"

"اس چنڈال سے بھگوان ہی بچائے" سبیتا نے ہنس کر کہا "دیکھیں کس ناچ نچواتی ہے غریب پچھمن کو"

کچھ دیر اسی طرح ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں پھر سبیتا نے کہا

"فرحت! میری چھوٹی بہن کی سگائی ہے۔ برادری کی عورتیں آئیں گی۔ اگر تم بھی دو گھڑی کو آجاؤ تو مجھے بہت خوشی ہوگی"

"کہاں بات طے پائی" فرحت نے پوچھا

"ایک مہاجن کا لڑکا ہے۔ اچھا کھاتا پیتا گھر ہے" سبیتا نے جواب دیا

"تو پھر آؤ گی نا؟" سبیتا نے کہا

فرحت نے ابھی جواب نہیں دیا تھا کہ میر شبیر حسین ایک اخبار پکڑے آئے اور بولے "میں مخل تو نہ ہوں گا"

"آپ کیوں مخل ہونے لگے" سبیتا نے کہا "تشریف لائیے"

شبیر حسین ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور سبیتا کی طرف وہ اخبار جو ہاتھ میں تھا بڑھا کر بولا "

"سبیتا دیوی! یہ دیکھو کیا لکھا ہے"

سبیتا نے شبیر کے ہاتھ سے اخبار لے لیا اور پڑھنے لگی۔ پھر مسکرا کر بولی "فرحت مبارک ہو؟"

"کیا ہے؟" فرحت نے بے پرواہی سے پوچھا

"اس اخبار میں تمہارے مضمون کی بہت تعریف کی گئی ہے" سبیتا نے جواب دیا

"پھر تو بہت بُرا ہوا!" فرحت نے جواب دیا

"بُرا کیسے؟" سبیتا نے تعجب سے پوچھا "تم نے جو مضمون سیاسی ترقی اور پردہ پر لکھا تھا۔ بہت پسند کیا گیا ہے"

"اسی لئے تو میں کہتی ہوں" فرحت بولی "کہ بہت بُرا ہوا غیر محرموں کی زبان پر میرا نام بھی آگیا اور میرا مضمون بھی انہوں

نے پڑھ لیا۔ ستم پر ستم۔ بے حیائی پر بے حیائی
"خاک سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہہ رہی ہو تم" سبیتا نے کہا
شبیر بولا
"سبیتا کماری! تم سے نہیں کہہ رہے۔ مجھ سے کہہ رہی ہیں"
"تعجب ہے!" سبیتا بولی "کہ آپ تعلیم یافتہ ہو کر غریب فرحت پر اتنی پابندیاں عائد کر رہے ہیں۔ بھائی جی! آپ کو معلوم ہے کہ یہ آزادی کا زمانہ ہے۔ اور ہم عورتوں کو بھی اس دنیا میں رہنے سہنے کا حق ہے"
"آپ اس آزادی کو پسند کرتی ہیں" شبیر نے پوچھا آپ کو یہ پسند ہے کہ آپ بے روک ٹوک غیر مردوں سے مل جل کر رہیں"
"کون غیر مردوں سے مل جل کر رہتا ہے" سبیتا نے پوچھا
"ہم لوگوں میں تو کوئی پردہ نہیں۔ پھر بھی میرے پتی تو عام جلسوں میں بھی مجھے نہیں لے جاتے۔ ہاں! اگر کہیں کوئی لیکچر ہو یا کوئی ادبی تقریب ہو تو میں چلی جاتی ہوں۔ بھائی جی! آزادی کے یہ معنی تو نہیں کہ عورت دن بھر جہاں چاہے ماری ماری پھرے بلکہ آزادی کا مفہوم تو یہ ہے کہ عورت کو بھی اظہار خیال کا

حق دیا جائے۔ پھر ایک مسلمان عورت کو آپ کے مذہب نے جو حقوق دیئے ہیں۔ ہم لوگ تو اس سے بالکل محروم ہیں آپ سچ مانیئے! ہمیں تو اپنی مسلمان بہنوں پر رشک آتا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ آپ کو آزاد خیال اور تعلیم یافتہ آدمی ہو کر اتنا بھی گوارا نہیں کہ فرحت لیڈیز کلب میں ہی کبھی کبھی چلی جایا کرے کیا آپ اپنی بیوی کو عورتوں سے بھی پردہ کروانا چاہتے ہیں"

"کون کہتا ہے!" شبیر بولا "کس نے کہا آپ سے میں نے تو آج تک انہیں عورتوں سے ملنے جلنے سے منع نہیں کیا۔ ہاں! لیڈیز کلب میں مجھے ان کا جانا پسند نہیں"

"نظر لگ جائے گی کیا؟" سبیتا نے ہنس کر پوچھا

"انہیں تو نظر نہیں لگے گی" شبیر نے جواب دیا "لیکن میں انہیں ان عورتوں کی نظر سے ضرور دور رکھنا چاہتا ہوں۔ جن کے طور طریق پسندیدہ نہیں"

"بھائی جی!" سبیتا نے ہنس کر کہا "یہ تو وہی بات ہوئی کہ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ جن عورتوں کے طور طریق آپ کو پسند نہیں بجائے اس کے کہ آپ ان کا کلب میں آنا جانا بند کریں۔ آپ دوسری عورتوں سے چاہتے ہیں کہ وہاں نہ جائیں

ذرا دل میں خیال تو فرمائیے کہ اصلاح کا یہی طریق ہوا کرتا ہے"

"لیکن!" شبیر بولا "کوئی کسی کو آنے سے کیسے روک سکتا ہے"

"روکنے کی بھی ضرورت نہیں" سبیتا نے جواب دیا "ان سے بول چال بند کردو۔ جہاں بیٹھیں وہاں مت بیٹھو۔ اگر بلائیں بھی تو ٹال دو بس خود ہی سمجھ جائیں گی کہ ہماری یہاں ضرورت نہیں"

"اس کے لئے جرأت چاہیئے" شبیر نے کہا

"جی ہاں!" اب کرشنا بولی "یہ واقعی بڑی جرأت کا کام ہے۔ لیکن گھر والی پر دھونس جمانی تو آسان ہے"

"ارے بابا!" شبیر بولا "کون دھونس جماتا ہے۔ کس پر دھونس جمائی میں نے۔ اتنی بات کا گنہگار تو میں ضرور ہوں کہ میں نے انہیں لیڈیز کلب میں جانے سے منع کیا تھا۔ لیکن اگر یہ اپنی ضد پر نہ آجاتیں تو شاید میں بھی اتنا زور نہ دیتا"

"ضد پر کیسے نہ آتیں" سبیتا بولی "آپ کے قومی شاعر جناب اقبال صاحب یہ کہتے ہیں کہ ؎

اس دور میں سب مٹ جائیں گے باقی وہ رہ جائے گا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے

مجھے تو تعجب ہے کہ آپ یہ حکم کیوں جاری نہیں کروا دیتے کہ

عورتیں سیر و تفریح بھی نہ کیا کریں کیونکہ راہ چلتے ان کی طرف پلٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں"

"تو کیا یہ جھوٹ ہے" شبیر نے پوچھا

"میں نے کب کہا" سبیتا بولی "کہ آپ جھوٹ کہہ رہے ہیں لیکن بجائے اس کے کہ آپ عورت کو اس کے جائز حق سے محروم کریں۔ آپ اس کا تدارک کیوں نہ کریں کہ کوئی بے غیرت راہ چلتی عورت کو گھور کر نہ دیکھے"

"اس کا علاج کیا ہو سکتا ہے" شبیر نے پوچھا "یہ مرض تو اب عام ہو رہا ہے"

"بھائی جی!" سبیتا بولی "یہ آپ کے سماج کی کمزوری ہے سماج کی اصلاح کیجئے۔ یہ مرض خود بخود جاتا رہے گا"

شبیر نے کہا

"لیکن جہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہو وہاں کوئی کیا کرے"

"ہمیشہ ایک شخص تحریک کا علمبردار ہوتا ہے" سبیتا نے جواب دیا "اگر تحریک مفید ہو تو اور لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں کوئی کام ایسا بھی ہے جو انسان چاہے اور نہ کر سکے"

"ہاں!" شبیر نے جواب دیا۔ "یہ تو آپ نے ٹھیک کہا"

"تو پھر آپ فرحت پر کیوں یہ پابندیاں عائد کر رہے ہیں" سبینا نے پوچھا۔ "فرحت تو ان عورتوں میں سے ہے جن سے ہم بہت سی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ لیکن شادی کیا ہوئی قفس میں بند ہو گئی بے چاری"

"یہ تو آپ نے غلط کہا" شبیر نے جواب دیا۔ "پوچھ لو ان سے"

"ان سے کیا پوچھوں" سبینا بولی۔ "جب آپ نے انہیں لیڈیز کلب میں جانے کی اجازت نہیں دی تو اور کہیں یہ خاک آجا سکیں گی"

"میں تو کہہ رہا ہوں" شبیر نے کہا۔ "انہی سے پوچھ لو"

اب فرحت بولی۔ "مجھ سے بعد میں پوچھئے پہلے اس اڈیٹر پر ہتک عزت کی نالش کر دیجئے۔ کہ اس نے ایک شریف زادی کا نام کیوں شائع کر دیا۔ اور سبینا! اگر تم کو میرے یہاں آنا جانا ہو تو پہلے ان سے تحریری اجازت لے لیا کرو۔ شاید شریعت میں غیر مسلم عورت سے ملنا جلنا بھی منع ہو"

"پھر تو بڑی غلطی ہوئی" کرشنا نے ہنس کر کہا۔ "چلو سبینا۔ اٹھو یہاں سے"

اور سبینا بولی۔ "فرحت! معاف کر دو۔ میں اپنی دعوت واپس لیتی ہوں"

"کیسی دعوت؟" شبیر نے پوچھا

"اجی آپ کو اس سے کیا؟" کرشنا بولی "آپ کے یہاں تو شاید ہم سے بات کرنا بھی حرام ہوگا"

"ارے بابا"! بخشو مجھے۔ غلطی ہوئی" شبیر نے ہنس کر کہا

"بھائی جی!" سبیتا نے کہا "آپ تو بہت خوش قسمت ہیں جو آپ کو فرحت ایسی منچلی بیوی ملی۔ لیکن افسوس ہے آپ نے قدر نہ کی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ع

گوہر کی پرکھ اور انساں کی پہچان پیدا کر

لیڈیز کلب میں جن عورتوں کا آنا آپ کو پسند نہیں۔ یقین مانئے! اگر فرحت کو آپ وہاں جانے سے نہ روکتے تو کب سے نکل گئی ہوتیں۔ آپ ذرا خیال تو فرمائیے کہ اس اخبار والے نے فرحت کے مضمون پر کتنا عمدہ ریویو کیا ہے۔ معاف فرمائیے! اگر میں یہ بھی کہہ دوں کہ فرحت وہ عورت ہے کہ کسی روز آپ کی قوم اس پر ناز کرے گی۔ لیکن اگر ...."

"رک کیوں گئیں سبیتا دیوی"، شبیر نے ہنس کر کہا "کہہ دو کہ اگر میری ہٹ یا کوتاہ نظری یہی رہی تو گھر میں خاک اڑ رہی ہوگی۔"

"بے شک!" سبیتا نے کہا۔

"اچھا بھئی!" شبیر بولا "غلطی ہوئی۔ معاف کر دیجئے۔"

"غلطی کا اقرار ہے" کرشنا بولی "تو ہماری بہن سے معافی مانگئے"

"ایک شرط پر" شبیر نے ہنس کر کہا۔

"کیا؟" کرشنا نے پوچھا

"جس دعوت کا ابھی ابھی ذکر ہو رہا تھا۔ اس میں ہمیں بھی مدعو کیا جائے گا" شبیر نے کہا

"اس سے زیادہ ہماری اور کیا عزت ہوگی" سبیتا بولی "جو آپ غریب خانہ پر تشریف لاویں"

"فرحت نے چلیں گی تو چلے جائیں گے" شبیر نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"تو معافی مانگئے!" کرشنا نے کہا

"کرشنا دیوی!" شبیر نے مسکرا کر کہا "تمہاری تو وہی بات ہے کہ مدعی سست اور گواہ چست!"

اور کرشنا نے ہنس کر کہا "گواہ چست ہی ہو تو مدعی مقدمہ بھی جیتتا ہے"

"اچھا بھئی معاف کر دو" شبیر نے بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا

فرحت مسکرا دی۔ فرمایئے! غلطی کس کی تھی؟ ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں ٭ کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

۹۱

مِلاپ

شام کا سہانا وقت اور سردی کی رُت تھی، ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے شیشوں میں سے ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں اس دُلہن کی نگاہوں سے ملتی جلتی تھیں جو رخصت کے وقت حسرت بھری نگاہوں سے ماں باپ کے گھر کو دیکھتی ہے۔

جہانیانِ جہاں گشت بوڑھا بہرام نرگس اور طاؤس ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے تھے، آتش دان میں آگ جل رہی تھی، نرگس اور طاؤس توصوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے لیکن بوڑھا بہرام ایک آرام کرسی پر خاموش بیٹھا چھوٹے چھوٹے شعلوں کی طرف دیکھ رہا تھا، کمرے میں بجلی کی روشنی تھی اور ایک ننھا سا لیکن شوریدہ سر پروانہ بجلی کے قمقمہ پر آگ سمجھ کر نثار ہو رہا تھا۔

"توبہ ہے! نرگس ایک جمائی لے کر بولی، آج تو بہت سردی ہے"۔ طاؤس نے بہرام کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا شرارت کے انداز سے کہا:۔

"لیکن اتنی نہیں جتنا بہرام جی کا دل سرد ہو چکا ہے"۔

"عمر کا تقاضا جو ٹھیرا،" نرگس بولی "ٹھیک ہے نا بہرام جی"۔

"کیا؟" بوڑھے بہرام نے ان دونوں کی طرف جو موسم بہار کے تازہ تازہ پھولوں کی طرح ایک دوسرے کے دوش بدوش بیٹھے مسکرا رہے تھے، دیکھ کر پوچھا۔

"کیا کہا؟"

"آپ سوتے ہیں یا جاگتے؟" نرگس بولی۔

"ہیں؟" بہرام نے نرگس کی طرف دیکھتے ہوئے "جاگتا ہی ہوں"۔

"طاؤس کہہ رہا تھا" نرگس نے کہا، "کہ آپ کا دل سرد ہو چکا ہے۔ اور میں کہہ رہی تھی کہ عمر کا تقاضا جو ٹھیرا، کیا خیال ہے آپ کا؟"

یہ سن کر بوڑھا بہرام مسکرایا اور کہنے لگا۔

"نرگس! پیری شباب ہے جو تمنا جواں رہے"۔

"لو سنو" طاؤس نے ہنس کر کہا، "کیا کہنے ہیں بہرام جی آپ کے"۔

"تم ذرا چپ ہی بیٹھے رہو" نرگس نے شوہر سے کہا، پھر بہرام کی طرف دیکھ کر بولی۔

"سمجھ گئی! تو گویا آپ کے دل میں ابھی تک کوئی شعلۂ خوابیدہ

موجود ہے ؟"

"خوابیدہ کیوں ؟" بہرام بولا، "جاگنا کھونا نرگس! یہ جینے کی آرزو یہ دنیا میں رہنے سہنے کی تمنا۔ آگ نہیں تو اور کیا ہے ؟"

"رہنے دیجئے!" نرگس بولی، "میں خشک زاہدوں ایسی باتیں نہیں کیا کرتی"۔

لیکن مجھے تو پسند ہیں" طاؤس پاس سے بولا، "میں تو سنوں گا!"

"تم سنو گے ؟" یہ کہتے ہوئے نرگس نے شوہر کے بازو میں زور سے چٹکی بھر لی۔ اور ساتھ ہی ایک جنبشِ جانانہ سے سر ہلا کر بولی۔

"ذرا غور سے سنئے"

"اے خدا کے لئے چھوڑ دے نرگس" طاؤس نرگس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"توبہ ہے جو سننے کا نام بھی لوں تو"

"کون منع کرتا ہے"، نرگس نے شرارت آمیز نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھ کر کہا۔

بہرام ہنسنے لگا۔

"نرگس! دیکھ لی زندگی کی تڑپ، اسے کہتے ہیں زندگی کی آگ"

"جی ہاں!" نرگس نے 'جی' کو لمبا کر کے جواب دیا "فلسفیوں کی طرح خاموش بیٹھے رہنا اور گاہے گاہے ایک لمبا سانس لے کر سر ہلا دینا ہی تو زندگی کی تڑپ یا زندگی کی آگ ہے، کہئے تو کیا سوچ رہے تھے آپ ؟"

"میں؟" بہرام نے پوچھا۔

"اجی نہیں" نرگس نے کہا "آپ کے فرشتے" پاس سے طاؤس کہنے لگا۔

"بہرام جی! کوئی چپ بیٹھے تو نرگس کا جی گھبرانے لگتا ہے۔"

"پھر وہی دخل در معقولات!" نرگس نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تو تمہاری ہی بات کہہ رہا ہوں" طاؤس نے ہنس کر کہا "بہرام جی بتلا دیجئے نا آپ ہی، کیا سوچ رہے تھے آپ؟"

"نرگس!" بہرام نے مسکراتے ہوئے کہا "تم بہت خوش نصیب ہو جو طاؤس ایسا شوہر ملا، حقیقت میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"حقیقت میں" طاؤس نے بات کاٹ کر کہا "میں بہت خوش نصیب ہوں جو نرگس ایسی بات بات پر بگڑنے والی جورو ملی۔ ٹھیک ہے نا بہرام جی؟"

"محض غلط کہہ رہے ہو تم" نرگس نے جواب دیا اور طاؤس نے ہنس کر کہا۔

"پہلے میری بات تو سنو، پھر فتویٰ بھی دے لینا"

"بات کس کی سنوں" نرگس نے کہا "کوئی سنانے والا بھی ہو؟"

"یہ اچھی رہی" طاؤس نے بہرام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، گویا ہم بات کرنا نہیں جانتے۔ شاید آپ کی طرف اشارہ ہو، سنا دیجئے نا آج بھی کوئی قصہ"

پھر بیوی کی طرف دیکھ کر۔
"اب تو خوش ہو۔ کردی نا میں نے تمہاری سفارش "

سورج غروب ہو چکا تھا۔ بامِ فلک پر سرخ رنگ کی بدلیاں یہاں وہاں نظر آ رہی تھیں۔ بوڑھے بہرام نے ایک لمبا سانس لیا اور اپنی لوچدار آواز میں گنگنانے لگا۔

خبر ہو غنچوں کو کاش اس کی ہے سوزِ پنہاں کلی کلی میں
قرار میں وہ مزا کہاں ہے جو لطف مضمر ہے بے کلی میں

"بہت خوب! بہت خوب!" طاؤس بھی سُر اور تال کے ساتھ سر ملا ملا کر کہنے لگا۔ ع

قرار میں وہ مزا کہاں ہے جو لطف مضمر ہے بے کلی میں

پھر نرگس کی طرف دیکھ کر۔
"سمجھ گئیں نا نرگس، کسی داستان کی تمہید ہے یہ"

لیکن نرگس جس کی طبیعت میں پارے کا تلون تھا، چپ بیٹھی بہرام کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک آہ بھر کر بولی۔
"حقیقت بھی تو یہی ہے"
اور طاؤس نے اُسے ذرا چڑانے کے لئے کہا۔
"فلسفۂ حیات کوئی تم سے ہی سیکھے"
لیکن نرگس جو عورت کی فطرت کے مطابق بہت متاثر معلوم ہوتی

تھی، بولی۔

"بہرام جی! ہنسی کا نام ہی تو زندگی ہے، کیا خیال ہے آپ کا؟"

"ٹھیک ہے،" بہرام نے جواب دیا۔ "لیکن ایسی زندگی جو ہمارے چنگِ حیات کے تار کو برہم رکھے۔"

"یہ تو واقعات پر منحصر ہے۔" نرگس نے کہا۔

"محض غلط؟" پاس سے طاؤس شرارت سے بولا۔

نرگس نے شوہر کی طرف دیکھ کر اور طنزاً مسکرا کر کہا۔

"اسے کہتے ہیں بے وقت کی راگنی، شاید بہرام جی کوئی واقعہ ہی بیان کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن تمہاری دخل در معقولات بسا اوقات بڑی نامعقول ہو جاتی ہے۔"

اس میں شک ہی کیا ہے،" طاؤس نے سنجیدگی سے کہا، "جب واسطہ ہی نامعقولوں سے پڑے تو کوئی کیا کرے۔"

یہ سن کر بہرام مسکرایا اور کہنے لگا۔

"زندگی کا مقصد بھی تو یہی ہے کہ انسان زندگی کے یہ چار دن ہنس کر گذار دے، میاں بیوی میں اگر محبت ہو تو گھر جنت بن جاتا ہے، لیکن۔ ۔ ۔ ۔"

"لیکن!" طاؤس نے بات کاٹ کر کہا۔ "سچ تو یہ ہے کہ ع

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

ساتھ ہی نرگس کے بگڑے تیور دیکھ کر جلدی سے کہنے لگا۔

"اور حقیقت میں جنت تو عورت کے دم سے ہے، آپ نرگس کو ہی دیکھ لیجئے نا۔ ع

"میرے ویرانے کو گلزار بنا رکھا ہے"

"ہاں ٹھیک ہے،" بہرام نے ہاں کو ذرا لمبا کر کے کہا۔ غلط فہمیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن محبت کا تسم تسم سب رکاوٹیں دور کر دیتا ہے"

"مثلاً" نرگس بولی۔ "کوئی مثال بھی تو پیش کیجئے۔

دعوئ بے دلیل کی قائل نہیں ہوں میں"

اور پاس سے طاؤس نے کہا۔

"سچ تو ہے۔ ع

شیدا نہیں ہوں آپ پہ مائل نہیں ہوں میں"

نرگس نے ساری کا جو اہر نگار پن نکالا اور شوہر کو دکھا کر بولی۔

"دیکھتے ہو نا یہ، کتنی تیز نوک ہے اس کی!"

"ہاں دیکھ تو رہا ہوں،" طاؤس نے جواب دیا۔

"اچھا اب بولیئو تم!"

بوڑھا بہرام ہنسنے لگا۔ اور نرگس بولی۔

"ہاں بہرام جی! کوئی مثال پیش کیجئے!"

"سنو!" بوڑھا کہنے لگا۔ کس طرح۔ ع

صلح ہوتی ہے جنگ ہو کر

جمیلہ اور ادریس تہذیب نو کے پروانے تھے، جمیلہ کے والدین کو اس کے لئے ایک تعلیم یافتہ، آزاد خیال، اور آسودہ حال بر کی ضرورت تھی، ادریس میں یہ سب خوبیاں موجود تھیں، جب سلسلہ جنبانی شروع ہوئی تو ان دونوں میں بھی چپکے چپکے نامہ و پیام ہونے لگا، پھر کسی ذریعہ سے تعارف بھی ہو گیا، اور پھر رفتہ رفتہ دونوں بے حجابانہ ملنے لگے، پہلے گھر پر ملاقات ہوا کرتی تھی، پھر یہ طریق بدل دیا گیا اب کوئی چار پانچ کے درمیان ادریس موٹر لے کر آجاتا، اور جمیلہ کو سوار کرا کر ساتھ لے جاتا، کسی ریسٹورنٹ میں چائے پیتے، پھر سینما دیکھنے چلے جاتے، جب جی چاہا ڈنر بھی کسی ہوٹل میں کھا لیا، آخر دونوں کی شادی ہو گئی، اور مس جمیلہ مسز ادریس کہلانے لگی، شادی ہوئے ابھی دو تین سال ہی ہوئے تھے کہ دونوں کی ہندوستانی ذہنیت اپنا رنگ لانے لگی، ادھر ادریس یہ محسوس کرنے لگا کہ جمیلہ کی بجائے گھر میں اس کا حکم چلنا چاہیئے، اور جمیلہ کو ہر بات میں اس کی مرضی کے تابع رہنا چاہیئے، اس لئے اب دونوں میں کچھ کھٹ پٹ سی رہنے لگی۔

"جمیلہ!" ادریس نے اخبار پھینکتے ہوئے کہا،" یہ ہر بات میں بگاڑ اچھا نہیں۔" "کون کہتا ہے اچھا ہے؟" جمیلہ نے جو پاس بیٹھی کروشیا کر رہی تھی، تنک کر جواب دیا۔

"یوں نباہ ہونا مشکل ہے۔" ادریس نے جمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نباہ کیسے ہو سکتا ہے" جمیلہ نے پھر اسی انداز سے جواب دیا۔
ادریس نے تعجب سے بیوی کی طرف دیکھا اور سر ہلا کر بولا۔
"سمجھ گیا، سب سمجھ گیا"
"شکر ہے آپ کو سمجھ تو آ گئی" جمیلہ بولی۔
"پھر کیا سوچا تم نے" ادریس نے پوچھا۔
"میں میکے جاؤں گی" جمیلہ نے جواب دیا۔ "آپ سنبھالیں اپنے گھر کو"
"کب جانے کا ارادہ ہے" ادریس نے بھی ذرا روکھے پن سے پوچھا۔
"بس آج ہی" جمیلہ نے کہا۔
"شکر ہے" ادریس نے طنزاً کہا "خدا نے اولاد نہیں دی"
"آپ باپ کہلانے کے قابل بھی ہوتے" جمیلہ بولی۔
"ہیں" ادریس نے ہنستے ہوئے کہا "باپ بننے کے قابل نہ سہی لیکن تم بھی تو ماں بننے کے قابل نہ ہو بیگ، تمہیں تو اپنی کنگھی چوٹی سے فرصت نہیں، کہیں ناخن پینٹ ہو رہے ہیں، کہیں بال بنائے جا رہے ہیں، ہونٹوں پر سرخی جمانے میں پہر بھر لگ جاتا ہے، یہ دھندے ختم ہوتے تو پھر ٹیلیفون ہے۔ اور تمہاری سہیلیاں ہیں کہیں سینما ہے اور کہیں ٹی پارٹی ہے، جانے وہ کون منحوس گھڑی تھی جو گھر میں ٹیلیفون لگوا لیا"

"اب اُٹھوا دیا؟" جمیلہ غصّہ سے بولی، "زلی میرا سینما یا کوئی پارٹی میں جانا تو آپ بھی ذرا گریبان میں منہ ڈالئے، برج کھیلنے بیٹھے تو صبح سے شام کر دی۔ پچھلے پہر گھر سے نکلے تو آدھی رات کو آ ٹپکے۔ میں کسی کی قیدی تھوڑی ہوں۔ جو سارا دن گھر بیٹھی رہوں۔"

"تو خیر!" ادریس نے کہا، "تو پھر کوٹھی کی بھی کیا ضرورت ہے، کہو تو اسے کرایہ پر چڑھا دیں!"

"میں کیا جانوں!" جمیلہ نے جواب دیا۔

"چڑھانی پڑے ہی گی!" ادریس کہنے لگا۔ "سجی سجائی ہے، کوئی کرایہ دار مل ہی جائے گا!"

"میری بلا سے!" جمیلہ نے پھر اسی طرح کہا۔ "ملے نہ ملے، مجھے کیا!"

"کب تک میکے رہنے کا ارادہ ہے"، ادریس نے پوچھا۔

"میں تو اس زندگی سے ہی تنگ آگئی ہوں!" جمیلہ روکھے پن سے بولی۔

"سچ جانو!" ادریس نے کہا، "میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں شادی کچھ راس نہیں آئی ہمیں!"

"بعض طبائع اس کے لئے موزوں نہیں ہوتے!" جمیلہ نے کہا۔

"جیسے ہم؟"

"بے شک!" جمیلہ نے جواب دیا، اور اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

جمیلہ کو میکے آئے بہت روز ہو چکے تھے، ادریس مہینے کے مہینے اسے کچھ روپیہ بھیج دیتا تھا۔ لیکن ملنا جلنا یا نامہ و پیام بالکل بند تھا۔ گو ماں کے یہاں بھی جمیلہ کو ہر طرح کی آزادی اور آرام میسر تھا لیکن پھر بھی وہ کچھ اجنبیت محسوس کرتی تھی، وقت کی ساعتیں کچھ طویل سی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ زندگی جس کی جستجو میں وہ شوہر سے الگ ہوکر میکے آئی تھی، یہاں بھی اُسے نہ ملی، جمیلہ دوشیزگی کی زندگی کے مزے ڈھونڈتی تھی، اور اسی سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنا چاہتی تھی، لیکن نقل کی تلخ کامی سے اس کی طبیعت خود بخود بیزار ہو جاتی، ماں کے گھر کی اُداسی سے جب اس کا ذوقِ نغمہ کم ہونے لگتا تو اپنی تلخ نوائی سے نوکروں کا ناک میں دم کر دیتی، یہاں بھی اُس نے اپنے مذاق کے مطابق ایک ڈرائنگ روم، ایک کھانے کا کمرہ اور ایک خواب گاہ بنا رکھی تھی۔ لیکن نہ تو ڈرائنگ روم میں سہیلیوں سے ملنے میں لطف، نہ چھری کانٹے سے کھانے کا مزا، اور نہ خواب گاہ کے سکوت میں آرام ملتا۔ دن تو خیر کسی طرح کٹ جاتا۔ لیکن رات کے وقت پلنگ، پلنگ ہوکر پھاڑ کھانے کو دوڑتا معلوم ہوتا تھا۔ اور سونے کے کمرے کی فضا میں اُداسی اور افسردگی محسوس ہوتی، اور جمیلہ اکثر سوچا کرتی کہ ایک حد تک تفکرات سے آزاد ہونے کے باوجود بھی اسے نیند کیوں نہیں آتی۔ ایک رات بیٹھے بیٹھے اُسے خیال آیا کہ رات کے وقت اُس کے کمرے میں جو لیمپ جلتا ہے، ہو نہ ہو اس کی روشنی ہی اس اُداسی اور افسردگی کا باعث ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ سبز رنگ

کے گلوب والا وہ خوبصورت چینی لیمپ جو ادریس اور اس کی خواب گاہ کی زینت تھا اور جس کے فروزاں ہوتے ہی عشق و محبت کے جذبات اُس کے دل میں پیدا ہو جاتے تھے، اُسے مل جائے تو شاید اسے رات کو نیند آجائے لیکن اس کے ساتھ اُسے یہ خیال بھی آیا کہ وہ لیمپ تو ادریس کا لیمپ ہے اور پھر اس کے پاس کوٹھی کی چابی بھی تو نہیں۔ جمیلہ اسی سوچ میں بیٹھی تھی کہ ماما آگئی۔

"کیا ہے؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"کوئی کام تو نہیں۔" ماما نے پوچھا۔

"کوئی کام وام نہیں۔" جمیلہ نے تلخ لہجہ میں جواب دیا۔

ماما ایک زنگ آلود چابی دکھا کر بولی۔

"یہ چابی آپ کی تو نہیں؟"

"نہیں۔" جمیلہ نے غصہ سے کہا۔ "لے جاؤ میری نہیں۔"

"دیکھ لیجئے۔" یہ کہتے ہوئے ماما نے ایک زنگ آلود چابی سنگار کی میز پر رکھ دی۔ "آج بھنگن نے مجھے دی تھی، غسل خانے کے باہر پڑی تھی۔"

یہ کہہ کر ماما تو چلی گئی اور جمیلہ پلنگ سے اُٹھ کر سنگار کی میز کے پاس آکھڑی ہوئی۔ کچھ دیر آئینہ کے سامنے کھڑی رہی، پھر بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ کنگھی رکھ کر اس نے چابی کی طرف دیکھا۔

"یہ یہاں کہاں سے آگئی۔" جمیلہ نے تعجب سے کہا۔

"یہ تو کوٹھی کی چابی ہے ۔"

اس کے ساتھ ہی اس کے چہرہ پر مسرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی ، اور وہ شال کندھوں پر ڈال کر چپکے سے گھر سے نکل گئی ۔

رات بالکل تاریک تھی ۔ ہوا بھی خاصی سرد تھی ۔ آسمان پر تاروں نے اپنی بساط بچھا رکھی تھی ۔ سڑک پر بجلی کی روشنی تھی ، کبھی کوئی موٹر ہارن بجاتی ہوئی پاس سے نکل جاتی ۔ کبھی کوئی تانگے والا ٹن ٹن کرتا ہوا پاس سے گذر جاتا ۔ جمیلہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی جا رہی تھی ۔ کہ ایک خالی تانگے والے نے سڑک پر سے گذرتے ہوئے پوچھا ۔

"حضور ! تانگہ چاہیئے ۔"

"ٹھہرو ۔" جمیلہ نے ہاتھ اُٹھا کر کہا ۔

تانگہ رُک گیا ۔ اور جمیلہ سوار ہو کر کوٹھی پر جا اُتری ۔ کوٹھی بند تھی ۔ چوکیدار غالباً سویا ہوا تھا ۔ لیکن پڑوس والی کوٹھی سے ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی ۔ جمیلہ نے قفل کھولا اور بجلی کا بٹن دبا کر کوٹھی میں روشنی کر دی ۔ لیکن کوٹھی کی حالت دیکھ کر اسے ایک صدمہ سا ہوا ، معلوم ہوتا تھا کہ گذشتہ چھ مہینوں سے صفائی کا کسی نے خیال نہیں کیا ۔ ڈرائنگ روم کی ہر چیز پر گرد پڑی ہوئی تھی ۔ کھانے والی میز پر گرد و غبار کی چادر چڑھی ہوئی تھی ۔ کلاک بند پڑا تھا ۔ یہی حال دوسرے کمروں کا تھا ۔ لیکن ٹیلیفون گرد و غبار سے صاف تھا ، اب وہ سونے والے کمرے میں آئی ۔ لیکن یہ کمرہ بالکل صاف تھا ۔ ادریس کا اور

اس کا پلنگ سامنے سامنے تھے۔ دونوں پر اجلی چادریں پڑی ہوئی تھیں اور کونے والی میز پر وہی چینی لیمپ رکھا تھا۔ جسے لینے وہ یہاں آئی تھی جمیلہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور سوچنے لگی کہ ادریس کی اجازت کے بغیر لیمپ اٹھا لے جانا چوری تو نہ ہوگا۔ چوری کے خیال سے اس کی پیشانی عرقِ انفعال سے تر ہو گئی۔ لیکن وہ اپنے آپ سے کہنے لگی۔

"نہیں چوری کیسی؟ اس کوٹھی کے اور اس سامان کے ہم دونوں ہی مالک ہیں۔"

"لیکن پھر بھی اجازت بغیر کوئی چیز اٹھا لے جانا تہذیب کے خلاف ہے۔"

"ادریس سے اجازت ضرور لینی چاہیئے۔"

"اسے کیا انکار ہوگا۔"

"ممکن ہے انکار ہی کر دے۔"

"وہ اسی اُدھیڑ بن میں بیٹھی تھی کہ سامنے والے کمرہ کا پردہ اُٹھا اور ادریس سر نکال کر دیکھنے لگا۔ اُس وقت اور یوں اچانک ادریس کو دیکھ کر جمیلہ کچھ ڈر سی گئی اور خوفزدہ نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ مسکراتا ہوا اندر آگیا۔

"یہ کیا بیہودگی ہے؟" جمیلہ نے غصہ سے کہا۔

تو کیا تم سچ مچ ہی ڈر گئیں" ادریس نے ہنس کر پوچھا۔

"آپ نے ڈرا جو دیا" جمیلہ بولی۔

"خیر!" ادریس نے کہا۔ "لیکن اس وقت کیسے یہاں آ ہیں؟"
"تو کیا یہاں آنا گناہ ہے،" جمیلہ نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"میں نے کب کہا کہ گناہ ہے؟" ادریس کہنے لگا۔ "لیکن اب تو بارہ بجنے کو ہیں۔"
"تو پھر کیا؟" جمیلہ نے بے رخی سے کہا۔
"آخر کشش کھینچ لائی نہیں؟" ادریس ہنس کر بولا۔
"کس کی؟ آپ کی! ہرگز نہیں۔"
"میری نہ سہی" ادریس نے کہا۔ "گھر کی ہی سہی۔"
"غلط" جمیلہ بولی۔ "میں تو صرف یہ چینی لیمپ لینے آئی تھی۔"
"لیمپ؟" ادریس نے تعجب سے پوچھا۔
"ہاں لیمپ" جمیلہ نے جواب دیا۔ "لیکن آپ یہاں کیسے آ گئے؟"
"تو کیا یہاں آنا گناہ ہے؟"
"میں نے کب کہا؟" جمیلہ بولی۔ "لیکن اب تو بارہ بجنے والے ہیں۔"
ادریس ہنسنے لگا۔
"تو اچھا تم یہ لیمپ لینے آئی ہو؟"
"لینے نہیں۔ بلکہ چرانے کے لئے۔"
"چرانے؟"
"ہاں" جمیلہ بولی۔ "چرانے آپ کی چیز جو ہوئی۔"

"اور تمہاری نہیں؟" ادریس نے پوچھا۔ "تم بھی تو مالک ہو۔"
"آپ نے ٹیلیفون کیوں نہیں اٹھوایا؟" جمیلہ نے پوچھا۔ شاید آپ یہاں ہی سوتے ہوں گے۔"
"سوتا تو ہوں۔" ادریس نے کہا۔ "لیکن نیند نہیں آتی۔"
"کیوں؟" جمیلہ نے پوچھا۔
"بتاؤں کیسے تمہیں۔۔۔۔"
جمیلہ بات کاٹ کر بولی۔
"تمہیں تو اپنی کنگھی چوٹی سے ہی فرصت نہیں، کہیں ناخن پینٹ ہو رہے ہیں۔ کہیں بال بنائے جا رہے ہیں۔ ہونٹوں پر سرخی جمانے میں پہر بھر لگ جاتا ہے، ان باتوں سے فرصت ہوئی تو پھر ٹیلیفون ہے اور تمہاری سہیلیاں ہیں۔ کبھی سینما ہے اور کبھی ٹی پارٹی ہے، جانے وہ کون منحوس گھڑی تھی جو میں نے ٹیلیفون لگوا لیا۔ ٹھیک ہے نا؟"
ادریس ہنسنے لگا۔
"خیر چھوڑو اس قصہ کو۔" اس نے کہا۔ "تو کیا تم سچ مچ یہ لیمپ لینے آئی ہو؟"
"صرف لیمپ لینے۔" جمیلہ نے کہا۔ "مجھے رات بھر نیند نہیں آئی کیونکہ میں اس لیمپ کی روشنی کی خوگر ہو چکی ہوں۔"
"تو پھر لے لو۔" ادریس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "تمہارا اپنا ہی تو ہے۔"

"نہیں" جمیلہ کہنے لگی، "میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔"

"وہ کیوں؟" ادریس نے پوچھا۔ "ارادہ کیوں بدل لیا؟"

"اس کے اُٹھ جانے سے اس کمرے کی خوبصورتی بھی جاتی رہے گی۔" جمیلہ بولی۔ "مسہری کے پردوں کا رنگ گلوب کے رنگ سے مل کر اس کمرے میں ایک پُرلطف فضا پیدا کر دیتا ہے۔"

"کیسی فضا؟" ادریس نے پوچھا۔

"وہ فضا جس سے روح کو تازگی، دل کو راحت حاصل ہو" جمیلہ نے جواب دیا۔

"اور اس کا نتیجہ؟" ادریس نے پوچھا۔

"محبت!" بیساختہ جمیلہ کے منہ سے نکلا۔

"سچ ہے!" ادریس نے مسکرا کر کہا۔ "لیکن بعض طبائع اس کے لئے موزوں نہیں ہوتے۔"

جمیلہ زیرلب مسکرانے لگی۔ ادریس نے پوچھا۔

"تم نے تالا کیسے کھولا؟"

جمیلہ وہی زنگ آلود چابی دکھا کر بولی۔

"اس سے"

ادریس نے چابی بیوی کے ہاتھ سے لے لی اور کہا۔

"جی چاہتا ہے کہ اس چابی کو چوم لوں۔"

"چابی کو؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"ہاں!" ادریس بولا۔ "ہمارے لئے تو یہ آج کلیدِ محبت بن گئی!"

یہ کہتے ہوئے اس نے چابی کے بجائے جمیلہ کا بوسہ لے لیا۔

یادگار

سید صاحب میرے ملنے والوں میں سے ہیں اور بہت مخلص آدمی ہیں۔ میری طرح آپ کو بھی افسانہ نگاری کا مرض ہے اور چونکہ آپ ماشاءاللہ جوان ہیں اس لئے افسانوں میں بھی جوانی کی جھلک نظر آتی ہے۔ خود چونکہ خوش وضع آدمی ہیں اس لئے پلاٹ بھی اچھا سوچھتا ہے، ہاں قد و قامت کے لحاظ سے آپ ذرا طویل واقع ہوئے ہیں، اس لئے آپ کے اکثر افسانے بھی طویل ہوتے ہیں۔

گرمیوں کا موسم تھا، میں برآمدہ میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا کہ آپ تشریف لے آئے۔

"میں مخل تو نہیں ہوا؟" آپ نے تشریف رکھتے ہوئے پوچھا

"فی الحال تو نہیں" میں نے جواب دیا۔

"غنیمت ہے"

"سید صاحب!" میں نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔ "انسان مرتا کیوں ہے؟"

"پیدا جو ہوا ہے۔" سید صاحب نے جواب دیا۔

"تو گویا انسان مرنے کے لئے پیدا ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہی مطلب ہے نا آپ کا؟"

"جی ہاں!" سید صاحب بولے۔ "جو کھلونا بنے گا وہ ٹوٹے گا بھی"

"ٹھیک ہے!" میں نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ جب مرنا انسان کی تقدیر میں ہے تو پھر اس کے مرنے پر ماتم کیوں کیا جاتا ہے"

"ماتم کرنا عین فطرت کے مطابق ہے" سید صاحب نے جواب دیا۔

"لیکن موت تو بہت خوفناک چیز ہے" میں نے کہا "کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

ڈرتا ہے دل بھی اپنا اور روح کانپتی ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بڑی بلا ہے

"واقعی" سید صاحب بولے۔ "کہنے سننے کو تو موت ایک خوفناک چیز ہے تو سہی۔ لیکن حقیقت میں بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ؎

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستمگر کا ستم انصاف کی تفسیر ہے

"کس طرح؟" میں نے پوچھا:-

اس وقت ایک بچہ کہیں سے آ نکلا اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"ہجور (حضور) ہمیں کپھن لے دیجیے۔"

ایک معصوم بچے کی زبان سے یہ خوفناک الفاظ سن کر میرے بدن میں لرزہ سا پیدا ہو گیا۔ بھولی بھالی صورت، میلے کچیلے کپڑے گورا چٹا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، چہرہ پر معصومیت کی جھلک کچھ ایسے ہی ہاتھ جوڑے اور گردن جھکائے سامنے کھڑا تھا۔

"کون ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"ہم گریب (غریب) ہیں" اس نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ "ہمیں کپھن لے دیجیے۔"

"ارے!" سید صاحب نے جیب سے ایک پیسہ نکال کر پوچھا، "پیسہ لوگے؟"

بچے نے ذرا للچائی ہوئی نظروں سے پیسہ کی طرف دیکھا اور پھر اسی طرح کہا:۔

"اماں نے کہا ہے کپھن لے دو۔"

"تمہارا باپ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اماں کہتی ہیں، ابا سو رہے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"تم کہاں رہتے ہو؟" سید صاحب نے پوچھا۔

"وہاں۔" اس نے ایسے ہی ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔ "کھینئیں

کے پاس۔"

"تمہاری ماں کہاں ہے؟"

"باہر کھڑی ہیں۔" معصوم نے جواب دیا۔

"جاؤ" میں نے کہا۔ "اُسے بلا لاؤ۔"

بچہ بھاگا بھاگا گیا۔ اور اپنی ماں کو ساتھ لے آیا۔

میں نے پوچھا۔

"بی بی! تم کون ہو؟"

"بیکس ہوں۔ بے آسرا ہوں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "للہ رحم کیجئے۔"

اس آواز میں خودداری مضمر تھی۔

"بچہ کیا مانگتا ہے؟" سید صاحب بولے، "کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

"باپ کے لیے کفن مانگتا ہے جناب!" عورت نے جواب دیا، "غریب صبح سے بے گور و کفن پڑا ہے۔"

یہ خوفناک الفاظ سنتے ہی میرے دل پر چرکا سا لگا، لیکن کہنے والی کا ضبط اور تحمل قابل داد تھا۔

سید صاحب نے جیب سے ایک اٹھنی نکال کر بچہ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اور کہا۔ "یہ لو۔"

عورت جس نے ایک میلا کچیلا برقعہ اوڑھ رکھا تھا، برقعہ میں سے ہاتھ نکالا اور بچہ کے ہاتھ سے اٹھنی لے کر کہنے لگی۔

"جناب اس میں کیا ہو سکے گا؟ میں بھکارن نہیں، لیکن کیا کروں، قسمت میں یہ دن دیکھنا تھا۔"

بات کرنے کا انداز اور خوبصورت ہاتھ صاف بتلاتے تھے کہ واقعی وہ بھکارن نہیں۔

"بی بی!" میں نے پوچھا، "تم کہاں رہتی ہو؟"

"جنگل کے پاس۔" اس نے جواب دیا۔

"جنگل کے پاس؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"جی ہاں!" وہ بولی، "للہ کچھ کفن دفن کا انتظام کر دیجئے میری بپتا پھر کسی وقت سُن لیجئے گا۔"

لیکن یہ کہنے کے ساتھ ہی دامنِ صبر و تحمل بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا، اور وہ روتے ہوئے بولی۔

"اس غریب کی تو لاش کے پاس بھی کوئی بیٹھنے والا نہیں۔"

ماں کو روتے دیکھ کر بچہ کی معصوم آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔

"صبر کرو بی بی!" میں نے کہا، ابھی انتظام ہو جاتا ہے۔"

اس کا جواب ایک دلخراش آہ تھی۔

میں نے نوکر کو بازار بھیج کر ضروری سامان منگوایا اور پڑوس کی مسجد سے ملاں جی کو ساتھ لیا۔ جب تانگوں میں سوار ہونے لگے تو سید صاحب نے پوچھا۔

"میت اٹھائے گا کون؟"

"غریب کی میت بھلا کون اٹھاتا ہے" عورت آبدیدہ ہو کر بولی "وہیں کہیں قبر کھود کر دفن کروا دیجیے"

"نہیں" سید صاحب فرمانے لگے "آپ چلیں، میں کچھ انتظام کر کے آتا ہوں"

دریا سے ذرا ہٹ کر جنگل کے دامن میں کسی دہقان کے کھیت تھے آب پاشی کے لیے ایک کنواں تھا اور وہیں کے ایک پیڑ کے نیچے ایک جھونپڑی تھی، جھونپڑی کے اندر چارپائی پر وہ بھلا آدمی ابدی نیند سو رہا تھا، جس کے لیے اس کی بیوہ اور معصوم بچہ کفن مانگ کر لائے تھے، ملاں جی نے میرے نوکر کے ساتھ مل کر پہلے لاش کو غسل دیا پھر کفن پہنایا، بدنصیب عورت اپنے بچے کو گود میں لئے الگ بیٹھی آنسو بہا رہی تھی، بچہ ماں سے کہہ رہا تھا۔

"امی! ابا اٹھتے کیوں نہیں؟"

"سو رہے ہیں امی!"

"ہم بھی ابا کے پاس جا کر لیٹ جائیں"

"امی ابا نے آج یہ نئے کپڑے کیوں پہنے ہیں؟"

یہ الفاظ سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی، میں جھونپڑی سے ذرا ہٹ کر اس راہ پر آ کھڑا ہوا، جدھر سے تانگے آنے تھے، ملاں جی میت کے پاس

بیٹھے قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے، خاصے خوش الحان تھے، ایک جنگل کا منظر دوسرے ایک بے کس عورت کی آہیں اور پھر کلام الٰہی کی تاثیر، آپ جانئے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچا ہوا تھا، آنکھیں خود بخود مائل گریہ ہو رہی تھیں، اتنے میں سید صاحب بھی آ پہنچے، اُن کے ہمراہ پانچ چھ درویش تھے۔

"غسل دے دیا؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر میت اٹھائیں" سید صاحب نے پوچھا۔

"کہاں لے چلیئے گا؟"

یہ سن کر سید صاحب بھی کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر کہنے لگے۔

"یہیں کہیں دفن کر دیں"

"دیکھ لیجئے"

اتنے میں وہ عورت بھی ہمارے پاس آگئی، اور بولی۔

"کیا سوچتے ہیں آپ؟"

"یہ کھیت کس کے ہیں؟" سید صاحب نے پوچھا

"ایک زمیندار کے ہیں" عورت نے جواب دیا۔

"زمیندار کہاں رہتا ہے"

"یہ جنگل کے دوسری جانب گاؤں ہے، وہاں ہے گھر اس کا" عورت بولی، لیکن اس غریب کو فوت ہوئے پانچ چھ ماہ ہونے کو ہیں"

سید صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

"میت گاؤں کیوں نہ لے چلیں، زمینداروں سے اجازت لے کر دفن کر دیں گے"

"کیا حرج ہے" میں نے کہا، لے چلیے۔"

جنازہ اٹھتے وقت اس عورت کی بے قراری دیکھی نہ جاتی، روتی تھی اور چارپائی سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ ادھر بچہ ماں سے لپٹ لپٹ کر کہہ رہا تھا۔

"امی یہ لوگ ہمارے ابا کو کہاں لے جائیں گے؟"

"ہم بھی ساتھ جائیں گے امی!"

"ابا ہم سے آج بولتے کیوں نہیں؟"

اور سید صاحب دونوں کو تسلی دے رہے تھے۔

آخر ہم جنازہ لے کر چلے۔ گاؤں کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہاں پہنچ کر ہم نے گاؤں والوں سے ان کے قبرستان میں میت دفن کرنے کی اجازت لی۔ اکثر زمیندار مرنے والے کو جانتے تھے، وہ چار اللہ والوں نے کندھا بھی دیا، اور قبر کھودنے میں بھی مدد دی، کوئی دو بجے تک ہم اس کام سے فارغ ہوئے، سید صاحب جو آدمی ساتھ لائے تھے انہیں آپ نے اجرت دے کر رخصت کر دیا، اور ملاں جی بھی حق خدمت پا کر چل دیئے اب ہم دونوں

آہستہ آہستہ پھر جھونپڑی کی طرف چلے۔
سید صاحب بولے "بہت حساس دل ہے آپ کا۔"
"طبیعت کی کمزوری سمجھئے" میں نے جواب دیا۔
"ایک دلِ دردمند تو نعمت ہے۔" سید صاحب بولے "اور آج اسی دل کے طفیل تو اس غریب کی لاش ٹھکانے لگی۔"
"سید صاحب!" میں نے کہا، "یہ عورت تو میرے لئے ایک معمّا ہے، اس کی ہر بات میں کچھ وقار اور خود داری پائی جاتی ہے۔"
"خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔" سید صاحب نے جواب دیا۔
"اُس وقت تو اس سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں۔" میں نے کہا "کیا خیال ہے آپ کا؟"
"وہ شاید خود ہی کہہ دے" سید صاحب بولے۔
"لیکن اب یہ جائے گی کہاں؟" میں نے کہا۔
"ہاں!" سید صاحب کہنے لگے۔ "ابھی جوان ہے شکل وصورت بھی اچھی پائی ہے۔"
"اور مجھے تو کچھ پڑھی لکھی بھی معلوم ہوتی ہے" میں نے کہا
"خیال تو میرا بھی ایسا ہی ہے۔"
کچھ اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے ہم اس کے پاس آپہنچے، معصوم بچہ گھاس پر سویا ہوا تھا۔ اور وہ ایک پھٹا پرانا کوٹ زانو پر رکھے رو رہی تھی۔ غالباً یہ مرنے والے کی نشانی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے

ذرا گھونگٹ سا نکال لیا۔ ہم دونوں ذرا ہٹ کر بیٹھ گئے۔

"بی بی!" میں نے کہا۔ "صبر کرو۔"

"ہاں جناب!" وہ بولی۔ "آج نہ کروں گی تو کل کروں گی، اب صبر کے سوائے میرے لئے ہے ہی کیا۔"

"اللہ مالک ہے۔" میں نے کہا۔ "جس نے پیدا کیا ہے، وہ زندگی کا سامان بھی کر دیتا ہے۔"

"سچ ہے جناب!" اس نے دوپٹے سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا "لیکن اگر کفر نہ ہو تو اتنی بات تو میں بھی کہوں گی کہ اللہ نے تو ہم غریبوں کو ایک مدت سے بالکل ہی بھلا رکھا ہے۔"

"صبر کرو بی بی!" میں نے کہا۔ "اللہ کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں۔"

"سچ ہے۔" اس نے آہ بھر کر کہا۔

بچے نے ایک آدھ کروٹ بدلی، پھر آنکھیں کھول کر ہماری طرف دیکھنے لگا، پھر اٹھ کر ماں کے پاس جا بیٹھا اور بولا۔

"یہ لوگ ابا کو کہاں لے گئے تھے امی!"

"اللہ میاں کے پاس!" عورت نے بچے کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ابا اب کب آئیں گے؟" بچے نے پوچھا، "تم بھی چلو امی!"

"میری ایسی قسمت کہاں بیٹا!" عورت نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا۔

کسی ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بیکس عورت کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"بی بی" میں نے کہا۔ "اب ارادہ کیا ہے؟"

"در در کی ٹھوکریں اور کیا" اس نے جواب دیا۔

"تمہارا اگر کوئی رشتہ دار ہو تو ہم تمہیں وہاں پہنچا دیں"

"میرا اب دنیا میں کوئی نہیں" وہ بولی "جس کا سہارا تھا اسے آپ مٹی میں دبا آئے"

"گھبراؤ نہیں" سید صاحب بولے، "تمہارا بیٹا کوئی دن میں جوان ہو جائے گا، دن سدا ایک سے نہیں رہتے، رنج کے بعد خدا راحت بھی دیتا ہے"

"جو اللہ کی مرضی" عورت نے ہولے سے کہا۔

"اب تم جاؤ گی کہاں؟" سید صاحب نے پوچھا۔ "یہاں تو تم رہ نہیں سکتیں"

"بھیک مانگوں گی" یہ کہتے ہوئے پھر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"مایوس نہیں ہونا چاہیے" میں نے کہا۔

"جناب!" وہ بولی۔ "مجھے اپنی تو فکر نہیں۔ فکر تو اس معصوم جان کی ہے" وہ جب تک جیتے ....."

لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی

"کیا کیا جائے" میں نے سید صاحب سے انگریزی میں کہا۔

"گھر میں ماما کی ضرورت ہے"، سید صاحب نے بھی انگریزی میں جواب دیا "شاید یہ کچھ کام کاج کرسکے"

"ضرور موقع دیجئے" میں نے کہا "کچھ میں بھی کوشش کروں گا"

"بی بی" سید صاحب بولے۔ "تم چاہو تو ہمارے یہاں چلی رہو۔ کچھ نہ کچھ انتظام ہوجائے گا"

"خدا بھلا کرے آپ کا" عورت نے جواب دیا۔ "میرے لئے تو آپ لوگ رحمت کے فرشتے بن گئے ہیں۔"

"تو پھر اٹھو، سید صاحب بولے، سامان لے لو۔ دو تانگے کھڑے ہیں"

اس واقعہ کے دو چار روز بعد میں تبدیل آب وہوا کے لئے باہر چلا گیا، یوں تو سید صاحب سے خط وکتابت رہتی تھی۔ لیکن نہ تو میں نے اس عورت کے متعلق کبھی کچھ پوچھا اور نہ کبھی انہوں نے کچھ لکھا ایک روز جو سید صاحب کا خط آیا تو اس میں اس عورت کا بھی ذکر تھا۔

"معاف فرمایئے" سید صاحب نے لکھا تھا۔ "میں نے آج تک اس عورت کے متعلق تو آپ کو کچھ لکھا ہی نہیں۔ جو دم واپسیں تک آپ کی تعریف کرتی رہی۔ لیکن جب آپ اس کی داستان سنیں گے تو تعجب کریں گے۔ بچہ اچھا ہے"

کوئی چار ایک ماہ بعد جب میں واپس آیا تو پہلی ہی ملاقات میں میں نے سید صاحب سے پوچھا۔

"یہ تو فرمایئے اس غریب کو ہوا کیا؟"

"غم کھا گیا اُسے"، سید صاحب نے جواب دیا، "واللہ بڑی ہی نیک اور باسلیقہ عورت تھی، مرنے سے کچھ روز پہلے اس نے مجھ سے اپنا قصہ کہا۔ لیکن جس ڈھنگ سے بیان کیا اس کی داد نہیں دی جا سکتی، ہمارے یہاں آتے ہی اس نے سب کے دل میں گھر کر لیا۔ پانچوں وقت نماز پڑھنا پھر تہجد گذار، میں نے اکثر دیکھا کہ اس اللہ کی بندی نے ساری ساری رات عبادت میں گذار دی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ مرنے والے کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے میرے پاس دعاؤں کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔ کوئی پندرہ بیس روز تو وہ اچھی رہی۔ لیکن اس کے بعد اسے بخار آنے لگا شہر میں بخار کی شکایت عام تھی۔ خیال تھا کہ ملیریا ہی ہو گا۔ لیکن بخار نے پیچھا نہ چھوڑا، اور جان لے کر ہی ٹلا، پر آفریں ہے اس کی ہمت پر، اس بخار میں بھی باوجود ہمارے روکنے کے، گھر کے کام دھندے میں لگی رہتی۔ ہم نے ہر چند چاہا کہ کسی ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے، لیکن رشیدہ نے ہمیشہ انکار ہی کر دیا۔"

"رشیدہ نام تھا"، میں نے پوچھا۔ "اور اس کے شوہر کا؟"

"رشید!" سید صاحب نے جواب دیا۔ "اور بچے کا نام عابد ہے خیر۔ علاج تو حکیم ہی کا رہا۔ لیکن چنداں افاقہ نہ ہوا، اسی طرح بہت

دن گذر گئے، ایک روز گھر کے لوگ کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے، میں جو کہیں باہر سے آیا تو میں نے اُسے چٹائی پر لیٹے ہوئے دیکھ کر کہا کہ بی بی تم چارپائی پر کیوں نہیں لیٹ جاتیں، وہ مسکرا کر بولی کہ چارپائی ہو تو، چٹائی ہو تو۔ آخر ایک روز مٹی ہی میں ملے گی۔"

"کم از کم پنکھا تو چلا لیا ہوتا۔" میں نے بجلی کا پنکھا چلاتے ہوئے کہا۔ "آج طبیعت کیسی ہے؟"

"شکر ہے۔" اس نے ایک آہ بھر کر کہا، موت کی راہ تکتی ہوں، نہ جانے نگوڑی کہاں بیٹھ رہی۔"

"اللہ کے فضل سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے" میں نے کہا۔ تم ڈاکٹر کا علاج کرو۔ آرام آ جائے گا۔"

"میاں! اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" میرے تو رو ئیں روئیں سے آپ کے لئے دعا نکلتی ہے، خدا جزا دے، بڑی بیگم صاحبہ کو، جن کی بدولت دنیا کے تفکرات سے جان چھوٹی ہے۔ اگر اس وقت میری ماں بھی ہوتی تو شاید اسے میری اتنی فکر نہ ہوتی۔

میں نے ہنس کر پوچھا۔"

"بی بی تمہاری ماں بھی ہے؟ کہاں ہے وہ؟"

"اللہ ہی جانے!" وہ بولی۔ "میں ان کے لئے مرگئی۔ وہ میرے لئے۔"

"بی بی!" میں نے پوچھا۔" تم کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"چھوڑیے اس قصّے کو" اس نے کہا، یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟

"انگریزی کا ایک رسالہ ہے" میں نے جواب دیا۔

"کیا لکھا ہے اس میں؟" اس نے پوچھا۔

"یہی قصّے کہانیاں ہیں" میں نے رسالے کے اوراق الٹتے پلٹتے جواب دیا۔

"آپ کو قصّے کہانیاں بہت پسند ہیں" وہ بولی۔

"پسند کا سوال نہیں" میں نے کہا۔ "وقت کٹ جاتا ہے"

"میں بھی آپ کو ایک قصّہ سناؤں" اس نے ذرا مسکرا کر کہا۔ "سنیں گے آپ؟"۔

"ضرور" میں نے جواب دیا۔

"سنیے!" وہ کہنے لگی "کسی قصبہ میں ایک بہت مالدار زمیندار رہتا تھا۔ اس کی صرف ایک ہی بیٹی تھی۔ اس کا نام پریم کور تھا، پریم کور کوئی پانچ ایک سال کی ہوئی ہوگی کہ والدین نے ایک بڑے امیر گھرانے میں اس کی شادی کر دی۔ لیکن قسمت دیکھیے کہ دلہن کے ہاتھوں کی ابھی مہندی بھی میلی نہ ہوئی کہ اس کے پتی کو قضا کا پیغام آ گیا، آپ جانتے جب ایک ہندو لڑکی رانڈ ہو جاتی تو اس غریب کے سر پہ مصائب کا آسمان ٹوٹ پڑتا ہے۔

وہی پریم کور جو دونوں گھروں میں کھلونا بنی ہوئی تھی اب اس کی اتنی بھی قدر نہ تھی جتنی ایک ٹوٹے ہوئے کھلونے کی ہوتی ہے، وہی بچی جو موسم بہار کے پھول کی طرح شگفتہ اور بلبل کی طرح چہچہاتی رہتی تھی اب ایک خانہ برباد

چڑیا کی طرح دبک کر خاموش بیٹھی رہتی، اب ہنسنا کھیلنا بھی اس کے لئے حرام، اچھا کھانا پہننا بھی حرام، اور تو اور ممتا کی ماری ماں بھی گھر والوں کے سامنے اپنے جگر کے ٹکڑے سے پیار نہ کر سکتی تھی۔ پریم کور اگرچہ معصوم تھی لیکن اسے اس مصیبت اور اپنے دکھ کا احساس ضرور تھا، خاندان بھر میں اگر اس سے کوئی ہمدردی کرتا تو وہ اس کا چچا زاد بھائی پریم چند تھا چونکہ پریم چند کا باپ ایک غریب آدمی تھا اس لئے پریم کور کے والدین نے اس کے لڑکے سے اپنی بیٹی کا بیاہ کرنا پسند نہ کیا۔ اس سے خاندان میں کچھ ناچاقی سی تو پیدا ہو گئی۔ لیکن غریب کی پرواہ کسے ہوتی ہے، کچھ عرصہ تو میل ملاپ بند رہا، آخر پریم کور کے پتی کے مرنے پر آنا جانا ہو گیا۔

پریم چند عمر میں پریم کور سے کچھ بڑا تھا اور مقامی مدرسہ میں تعلیم پاتا تھا، مدرسہ سے چھٹی ہوتے ہی پریم کور کے یہاں آجاتا اور دونوں مل کر کھیلتے، لیکن سب سے الگ تھلگ یا یوں سمجھئے کہ کوئی دوسرا ان کے پاس آنا پسند ہی نہ کرتا، کبھی مٹی کے گھروندے بناتے، کبھی آنکھ مچولی کھیلتے، گاہے جھولا جھولتے۔

ایک روز کوئی تہوار تھا، بچوں نے اچھے اچھے کپڑے پہن رکھے تھے، پریم چند سرخ ساٹن کی ٹوپی اور اجلا لباس پہنے ہوا تھا۔ لیکن پریم کور غریب کے آج بھی وہی گاڑھے کی ساڑی باندھی تھی۔

"پریم!" پریم چند نے تعجب سے پوچھا! یہ کیا؟ تم نے آج بھی گوٹے کناری

والے کپڑے نہیں پہنے!"

پریم کور نے جواب دیا۔

"ماں کہتی ہے، تم گوٹے کناری والے کپڑے اب کبھی نہیں پہن سکوگی۔"

"پریم چند نے پوچھا۔

"کون منع کرتا ہے۔"

پریم کور نے جواب دیا

"بھگوان منع کرتے ہیں۔"

اور پریم چند بولا۔

"ہمیں تو بھگوان منع نہیں کرتے۔"

پریم کور بولی

"ماں کہتی ہے، بھگوان ناراض ہو گئے ہیں۔"

پریم چند نے ذرا سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

"سمجھ گیا۔ جبھی تمہاری سہیلیاں بھی تم سے ہٹ کر رہتی ہیں لیکن تم پروہت کو کچھ دے کر بھگوان کو راضی کر لو نا۔"

"کون دے۔" پریم کور نے کچھ معصوم صورت بنا کر کہا۔

"تمہاری ماں۔" پریم چند بولا۔ "اور کون۔"

پریم کور چپ ہو رہی۔ اور پریم چند نے کہا۔

"اور تم میلے بھی نہیں جاؤ گی۔"

"نہیں!"

"اچھا!" پریم چند نے کہا۔ "میں تمہارے لئے بھی کھلونے لاؤں گا!"

پریم چند کے سوا گاؤں میں مسجد کے مولوی کی لڑکی عائشہ تھی جو پریم کور کے ساتھ اکثر کھیلا کرتی۔ گاؤں کی مسجد کے لئے پریم کور کے باپ نے جو ایک گیانی آدمی تھا، زمین دی تھی۔ اور فصل کی فصل زمیندار کے یہاں سے مولوی جی کو کچھ اناج وناج بھی مل جاتا تھا۔ مسلمانوں کے لڑکے مسجد میں مولوی جی سے سبق لیتے اور گھر میں اُستانی لڑکیوں کو پڑھاتی۔ عائشہ اور پریم کور ہم عمر تھیں۔ عائشہ کی ماں پریم کور سے بہت محبت کرتی اور اسے اس بچی کی بپتا پر افسوس بھی تھا۔ کبھی کبھی پریم چند بھی کتابیں گھر چھوڑ کر مولوی جی کے یہاں آ جاتا۔ لیکن اس کے والدین کو ایک مسلمان کے گھر اس کا زیادہ بیٹھنا پسند نہ تھا۔ لیکن گاؤں بھر میں صرف مولوی کا گھر ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں پریم کور ہنس سکتی تھی۔ کھیل سکتی تھی جھولا جھول سکتی تھی اور مولوی کی بیوی اور لڑکی اُسے منحوس نہ خیال کرتی تھیں۔

وقت اسی طرح گذرتا گیا۔ اور پریم کور کڑوی بیل کی طرح بڑھتی گئی اور پریم چند سرو گلستاں کی طرح شاداب ہوتا گیا۔ لیکن جوں جوں عمر بڑھتی گئی کچھ سوجھ بوجھ بھی آتی گئی، احساس کا مادہ بھی ترقی کرتا گیا اور اب دونوں کے مل کر اودھم مچانے کے دن بھی بیت گئے، اب پریم کور کا زیادہ تر وقت عائشہ

کے یہاں گذرتا، عائشہ ماں سے سبق لیتی تو پریم کور بھی سنتی اور پھر خود بھی بعض سہیلی کی دیکھا دیکھی سبق لینے لگی ۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اسے کچھ حرف شناسی بھی ہو گئی ۔

اب پریم چند سے ملاقات یا تو جوہڑ پر جہاں وہ اپنی گائے کو پانی پلانے آیا کرتا تھا ہوا کرتی یا کبھی زمینداروں کے کھیتوں میں دونوں دو گھڑی کے لئے مل بیٹھتے ۔ اور اب دونوں کے لئے اتنا ہی غنیمت تھا کہ لوگوں کو ان کا یوں ملنا ناگوار نہ تھا ۔ لیکن اب وہ بھولے پن کی باتوں کے بجائے گفتگو کا انداز کچھ اور ہی ہوتا ۔

ادھر عائشہ کی صحبت میں پریم کور نے نماز پڑھنا بھی سیکھ لیا ۔ اور کئی دعائیں بھی اسے ازبر ہو گئیں ۔ اردو کی دو چار کتابیں جو عائشہ کے پاس تھیں اور ایک مولوی کے گھر میں ان کے پڑھ لینے کے بعد اردو کی تعلیم کی تکمیل ہو جاتی تھی وہ بھی وہ پڑھ چکی تھی ۔

ایک روز پریم کور کا باپ دالان میں چارپائی ڈالے بیٹھا تھا، دو تین زمیندار اور بھی پاس آ بیٹھے ، باتوں باتوں میں ایک کہنے لگا ۔

"چودھری! کچھ سنا تم نے بھی!"

"کیا!" پریم کور کے باپ نے پوچھا ۔

"آپ کی بیٹی تو اب قرآن پڑھتی ہے!" اس نے کہا ۔ "اور مولوی کی بیٹی سے اس نے نماز بھی سیکھ لی ہے!"

چودھری نے مسکرا کر کہا۔

"تو بھائی! یہ کوئی بڑی بات تو نہیں، کچی سی تو ہے شو قیہ سیکھ لی ہوگی۔"

"لیکن ان باتوں سے دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے"، اس نے جواب دیا

چودھری بولا۔

"بھگوان کو یاد کرنے سے دھرم بھرشٹ کیسے ہو جاتا ہے کسی نے رام کہہ لیا کسی نے رب کہہ کر پکار لیا۔ کچھ فرق تو پڑتا نہیں"

"اور یہ نماز؟"

"وہ مولوی کی چھوکری پڑھتی ہوگی۔ تو پریم کور بھی نقل کے طور پر کھڑی ہو جاتی ہوگی"، چودھری نے ہنس کر کہا۔

"پھر بھی یہ رسم تو مسلمانوں کی ہے"

"چودھری! تم جانو" جاٹ بولا "لیکن خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ جوان چھوکری سارا دن مسلمانوں کے گھر گھسی رہتی ہے مجھے تو ڈھنگ اچھے نہیں نظر آتے"

"بیٹا جو پڑ گئی غریب پر" پریم کور کے باپ نے ایک آہ بھر کر کہا۔ جس نے پریم سے بلایا اسی کے پاس جا بیٹھی، زندگی کے دن بھی تو پورے کرنے ہیں کسی طرح۔ وہ مولوی کی بیوی تو پریم پر جان چھڑکتی ہے اور عائشہ سے تو اس کا بہناپا ہے بھائی! پریم کا نام دھرم ہے۔ جو پریم نہیں تو کچھ نہیں"

مہترانی کہیں پاس ہی جھاڑو دے رہی تھی۔ اس نے جو یہ باتیں سنیں تو مولوی کی بیوی سے جاکر کہہ دیں۔ اسے فکر ہوئی کہ کہیں پریم کور کا باپ ناراض نہ ہو جائے، چنانچہ جب پریم کور آئی تو اس نے باتوں باتوں میں کہا:-

"پریم تیرے گھر والے یہاں آنے سے ناراض تو نہیں ہوتے؟"

"نہیں استانی جی!" پریم کور نے جواب دیا۔

"اور یہ جو عائشہ کے ساتھ مل کر نماز پڑھتی ہے، اگر کہیں چودھری نے دیکھ لیا تو پھر؟" استانی بولی۔

یہ سن کر پریم کور ہنسی اور کہنے لگی۔

"استانی جی! میرے پتا تنگ خیال آدمی نہیں، آج انہوں نے مجھ سے بھی پوچھا۔ بہت ہنسے تھے۔"

عائشہ کی ماں مطمئن ہو گئی۔

عائشہ کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ اس خیال سے کہ عائشہ کے چلے جانے کے بعد وہ اکیلی رہ جائے گی، پریم کور اکثر اداس سی رہتی گاؤں سے کچھ فاصلے پر ندی بہتی تھی۔ ایک روز سائے ڈھل چکنے کے بعد وہ گھر سے نکلی اور سیدھی ندی کی طرف ہولی۔ وہ جب کبھی ندی پر آیا کرتی عائشہ بھی اس کے ساتھ ہوتی۔ لیکن آج وہ اکیلی ہی ادھر چل پڑی۔ املی کے پیڑوں پر کونپلیں آئی ہوئی تھیں، پرندے ڈالیوں

میں چھپے بیٹھے ایک دوسرے سے اختلاط کر رہے تھے، اور کسی کسی پیڑ پر سے ہریل کی میٹھی اور سوز بھری سیٹی بھی سنائی دینے لگتی۔ ہوا جب درختوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی تو ڈالیاں کسی سرمست شباب کی طرح جھومنے لگتیں۔ اور پتے تل تل کر تالیاں بجاتے۔

پریم کور ندی پر پہنچ کر ایک آم کے نیچے بیٹھ گئی، آم کا سایہ بھی اس وقت سینۂ آب پر رقص کر رہا تھا۔ اور دور فاصلے پر سقف فلک کے نیچے پہاڑوں کے دھندلے دھندلے سے نشان نظر آرہے تھے۔

پریم کور کی آنکھوں میں جوانی کا خمار تھا۔ اور دل جوانی کے جذبات سے لبریز، لیکن بے رحم سماج نے اس کی قسمت پر مہر لگا دی تھی۔ جوانی کے خمار اور جوانی کے جذبات کا خیال تک کرنا بھی اس کے لئے پاپ تھا، لذت گیر ہونے کا ذکر ہی کیا۔ ایک مولوی کے گھر میں نشست و برخاست زیادہ ہونے کے باعث وہ مسلمانوں کے رسم و رواج اور ان کے عقائد سے بہت واقف ہو چکی تھی، اسے اس بات کی سمجھ تھی کہ سماج کو ہرگز کوئی حق نہیں کہ اسے "جیون ناس" پر مجبور کرے۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ یہ سراسر قوانین قدرت کے خلاف ہے کہ ایک جوان لڑکی لپنے جذبات، اپنی خواہشیں آرزوئیں اور زندگی کی مسرتیں اس لئے حرام سمجھے کہ قسمت نے بچپنے ہی میں اس کی پیشانی پر ٹیکہ لگا دیا ہے۔

وہ عائشہ کی ماں سے کئی بار یہ سن چکی تھی کہ ایک بیوہ کو شادی کی

اجازت نہ دینا مذہب میں ہرگز جائز نہیں۔ مذہب نے کہیں ایسا حکم نہیں دے رکھا کہ ایک بیوہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ دوسری شادی نہ کرے۔

"بھگوان!" اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تو سب کا بھگوان ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تیرے بندوں کے لئے تیرے احکام بھی ایک سے نہ ہوں۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے لیکن اس خوف سے کہ کوئی راہگیر دیکھ نہ لے اس نے آنچل سے آنکھیں خشک کر لیں لیکن جب دل کو ٹھیس لگی ہو تو آنکھوں پر قابو ذرا مشکل ہوتا ہے۔

وہ اسی طرح خاموش بیٹھی اپنی بے دست و پائی اور بے کسی پر آنسو بہا رہی تھی کہ کہیں سے پریم چند بھی گھومتا گھامتا آنکلا۔

"پریم!" اس نے تعجب سے کہا۔ "تم رو رہی ہو۔ کیوں؟"

"اپنے کرموں کو رو رہی ہوں۔" پریم کور نے آنچل سے آنسو خشک کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کسی نے کچھ کہا؟" اس نے پھر پوچھا۔

لیکن پریم کور نے جب کچھ جواب نہ دیا تو وہ ذرا ہنس کر بولا۔

"سمجھ گیا۔ تمہاری سہیلی عائشہ کی شادی جو ہونے والی ہے، بس جدائی کے خیال سے تم رو رہی ہو گی، ٹھیک ہے نا پریم؟"

"تمہاری شادی کی بھی تو بات چیت ہو رہی ہے۔" پریم کور نے کہا۔

"تم سے کس نے کہا؟" اس نے پوچھا۔

"جی (پریم کی ماں) کل پرسوں کہہ رہی تھی،" پریم کور نے جواب دیا۔
"ماں کے کہنے سے کیا ہوتا ہے،" پریم چند مسکرا کر بولا "کوئی زبردستی کا سودا تو ہے نہیں کہ جس سے دل چاہا باندھ لیا۔"
یہ سن کر پریم کور تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
"کیا دیکھ رہی ہو؟" پریم چند نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔
"تم شادی نہیں کرو گے؟"
"کروں گا تو سہی۔ لیکن ....."
"لیکن کیا؟" پریم کور نے پوچھا۔
"پہلے تم بتاؤ،" پریم چند کہنے لگا "تم یہاں بیٹھی کیا سوچ رہی تھیں؟"
"میں یہ سوچ رہی تھی،" پریم کور بولی "کہ کیا اچھا ہو جس طرح یہ ندی خس و خاشاک بہائے لئے جا رہی ہے، مجھے بھی بہائے جائے اور ایک ایسی سرزمین میں پہنچا دے جہاں ...."
"جہاں کیا؟" پریم چند نے پوچھا
"کچھ نہیں۔" پریم کور نے وہ آنسو جو اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے تھے آنچل سے پونچھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے، پھر پریم کور بولی
"تو ہاں کیا شادی نہیں کرو گے تم؟"

"پہلے تم میری ایک بات کا جواب دو۔" پریم چند بولا۔ "پوچھوں"
"کیا؟"
"ناراض تو نہیں ہو گی؟"
"نہیں؟"
"ہنسو گی بھی نہیں؟"
"نہیں۔"
"ٹھیک ٹھیک کہہ دو گی؟"
"ہاں۔"
"پریم! تم میری بنو گی؟" پریم چند نے پوچھا۔
یہ سنتے ہی پریم کور کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور وہ ایک آہ بھر کر بولی۔
"کیسے بن سکتی ہوں؟"
"کون روکتا ہے؟" پریم چند نے پوچھا
"دھرم"
دونوں کے سر خود بخود جھک گئے۔
پریم چند چھوٹی چھوٹی کنکریاں اٹھا اٹھا کر ندی میں پھینک رہا تھا اور پریم کور حسرت بھری نگاہوں سے ان پہاڑوں کی طرف دیکھ رہی تھی جو انسان کی بے مائیگی کا شکوہ فلک پیر سے کر رہے تھے۔
لیکن دھرم پاپ تو نہیں سکھلاتا؟" پریم چند نے اس مہر سکوت کو

توڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں"

"اور دھرم" پریم چند بولا۔ "انسان کو دنیا کی لذتوں سے محروم رہنے کا اپدیش بھی تو نہیں دیتا"

"نہیں"

"اور جیون ناش کا حکم بھی تو دھرم نہیں دیتا" پریم چند نے پھر کہا۔

"نہیں"

"اور پھر تم نے اپنی زندگی کیوں برباد کر رکھی ہے!" پریم چند نے پوچھا

"کیا کروں" پریم کور نے ایک آہ بھر کر کہا "کہاں جاؤں"

"رام جانے" پریم چند نے کہا "مجھ سے تمہارا دکھ نہیں دیکھا جاتا"

"بیاہ ہو جائے گا تو سب بھول جاؤ گے" پریم کور نے جواب دیا۔

"پریم!" پریم چند نے اس کی طرف منت کے طور پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر تم میری ہو جاؤ تو یہ جان بھی تمہارے لئے حاضر ہے"

"اور دھرم" پریم کور نے ہولے سے کہا۔

"دھرم کا اس میں دوش نہیں" پریم چند نے جواب دیا "ہم نے رسم و رواج کی زنجیریں خود اپنے پاؤں میں ڈال رکھی ہیں"

"یوں ہی سہی" پریم کور بولی "لیکن یہ زنجیریں تو ٹوٹنے سے رہیں"

"ٹوٹ سکتی ہیں پریم!" پریم چند نے جواب دیا، "تم چاہو تو آج ہی ٹوٹ سکتی ہیں"

"پاگل تو نہیں ہو گئے" پریم کور نے مسکرا کر کہا۔
"میری بنو گی؟" پریم چند نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔
"سچ مچ ہی پاگل ہو" پریم کور نے ہنس کر کہا۔
"رام کے لئے میری بات کا جواب دو" پریم چند نے پھر منت سے کہا۔
"کیا جواب دوں" پریم کور نے ایک آہ بھر کر کہا۔
"پریم!" پریم چند نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "تم ہاں کرو تو میں سب کچھ چھوڑنے کے لئے تیار ہوں"
"میری ہاں سے کیا ہوتا ہے" پریم کور نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "نہ تم میرے ہو سکتے ہو، نہ میں تمہاری، نہ دھرم، نہ سماج، نہ رسم و رواج اور نہ ہی بھگوان کا کوئی بھگت میری مصیبت ٹال سکتا ہے"
"لیکن عائشہ کا باپ؟" بے ساختہ پریم چند کے منہ سے نکلا۔
پریم کور تعجب اور خوف سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ لیکن جب وہ گاؤں کو لوٹے تو ان کی آنکھوں میں مسرت کی جھلک اور چہرہ پر مسرت کی سرخی تھی۔ اب ان کی امیدوں کا دارومدار عائشہ کے باپ پر تھا۔ لیکن ایک سادہ لوح مولوی کے سامنے دونوں نے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ خوفزدہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے خوف تھا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو گیا تو نہ جانے اس سے کیا سلوک ہو۔ لیکن عائشہ اور اس کی ماں کے سامنے آخر اسے جھکنا ہی پڑا۔ پہلے دونوں مشرف با سلام ہوئے، پھر اسی وقت ان کا عقد ہو گیا۔ اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔

جس روز عائشہ کی برات آئی اسی روز گاؤں کے ایک مہاجن کی لڑکی کی بھی برات آئی۔ لڑکے والے طائفہ بھی لاتے اور آتشبازی بھی لوگ تو تماشہ دیکھنے میں مشغول تھے اور وہ دونوں۔۔۔۔

"کون دونوں؟" میں نے پوچھا۔

"رشید اور رشیدہ" بی بی نے ذرا مسکرا کر جواب دیا "چپکے سے گاؤں سے نکلے اور وطن سے بہت دور ایک شہر میں آ بسے، یہاں رشید کو ایک کارخانے میں ملازمت مل گئی۔ کام گو بہت سخت تھا۔ لیکن اجرت بھی خاصی ملتی تھی۔ بسر اوقات بے فکری سے ہو رہی تھی۔ گھر کا ضروری سامان بھی خدا نے دے دیا تھا۔ لیکن تقدیر کا کوئی کیا کرے۔ ایک روز کچھ ایسا حادثہ پیش آیا کہ رشید کا ہاتھ کٹ گیا۔ انہی دنوں رشیدہ کی گود ہری ہونے والی تھی۔ رشیدہ کو ہسپتال گئے کوئی ہفتہ عشرہ ہوا تھا کہ اللہ میاں نے اسے ایک بیٹا عطا کیا۔ کوئی دو مہینے بعد رشید ہسپتال سے آگیا۔ اب اس قسم کی محنت مزدوری تو اس سے ہو نہیں سکتی تھی۔ کارخانے والوں نے ترس کھا کر اسے چپراسی کی جگہ دے دی، رشیدہ فرصت کے اوقات میں ازار بند بنا کرتی۔ اس طرح دو چار آنے مل جاتے۔ لیکن رشیدہ تو جیسے کی منحوس تھی۔ ایک روز دفتر کے خزانچی کی میز پر سے کسی نے سو روپے کا ایک نوٹ اٹھا لیا۔ الزام غریب رشید پر لگا، غریب کا تھا کون جو کچھ امداد کرتا۔ عدالت سے سال بھر کی سزا ہو گئی آپ جانئے! جب کمانے والا گرفتار بلا ہوا تو پھر رشیدہ پر کیا گذرتی ہوگی۔ وہ ہر وقت درگاہ ایزدی میں اس بے کس کے لئے دعا کرتی۔

رشید کو جیل گئے ابھی کوئی چار ایک مہینے ہوئے تھے، رشیدہ کوٹھڑی میں بیٹھی تھی کہ اچانک رشید کہیں سے آ نکلا۔ رشید کو دیکھ کر رشیدہ کی تو یہ حالت ہوئی جیسے کسی نے مبہوت کرکے بٹھا دیا ہو، رشید نے بچے کو گود میں لے کر سینے سے لگا لیا اور ہنس کر بولا۔

"رشیدہ کیا ڈر گئیں؟"

"تم کیسے آ گئے؟" رشیدہ نے پوچھا۔

"اللہ نے بے گناہ کی سن لی۔" رشید نے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

اب فرط خوشی سے رشیدہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور اس نے دل ہی میں اس مالک کا شکریہ ادا کیا۔ جس نے آج اسے یہ خوشی کا دن دکھایا تھا۔ رشید نے جیب سے دس دس روپے کے دس نوٹ نکال کر رشیدہ کے سامنے رکھ دیئے۔

"یہ کہاں سے ملے؟" رشیدہ نے مسکرا کر پوچھا۔

رشید نے بتایا کہ روپے دراصل پہرہ دار نے چرائے تھے، خزانچی نے سو روپے کا نوٹ جو گم ہوا تھا اس کے نمبر کا اعلان کر رکھا تھا۔ کچھ روز ہوئے پہرہ دار کسی صراف کی دکان پر نوٹ بھنا رہا تھا۔ اس نے اسی وقت گرفتار کروا دیا۔ عدالت نے اصل ملزم کی گرفتاری پر اسے رہا کر دیا اور سو روپے بطور معاوضہ دلوا دیئے۔

جیل میں جو چار مہینے رشید غریب کو کاٹنے پڑے اس سے اس کی صحت

پر بہت بڑا اثر پڑا۔ جیل میں رشید کو ایک مالی کے ساتھ مل کر کام کرنا پڑتا تھا۔ رشید نے باتوں باتوں میں اسے کچھ اپنے حالات بھی سنا دیئے، مالی خدا ترس آدمی تھا۔ اسے رشید پر بہت رحم آیا۔ دونوں میں کچھ دوستی سی ہو گئی۔ اب جو رشید جیل سے نکل کر گھر آ گیا۔ تو مالی بھی اسے دسویں پندرھویں روز اُسے ملنے آیا کرتا۔ رشید کا ارادہ تھا کہ اس روپے سے وہ کچھ بنج بیوپار کرے، لیکن مالی نے اسے کھیتی باڑی کے کام کی ترغیب دی کیونکہ رشید کھیتی باڑی کا کام خوب سمجھتا تھا، مالی کی دریا کے پاس کہیں کچھ تھوڑی سی زمین تھی، مالی کا باپ کسی مقدمہ میں ماخوذ تھا، کھیت ایسے ہی پڑے تھے، رشید یہ کھیت بھی دیکھ چکا تھا، آخر یہ فیصلہ ہوا کہ زمین اجارے پر لے کر کسی ساجھی کو ساتھ ملا کر کھیتی باڑی کا کام کیا جائے لیکن صحت زیادہ خراب ہونے کے باعث رشید کھیتوں پر نہ جا سکا، غربا علاج جیسا کچھ میسر تھا ہو رہا تھا۔ لیکن طبیعت سنبھلنے میں نہ آتی۔ آخر اس خیال سے کہ شہر سے باہر کھلی ہوا میں رہنے سے صحت کو بھی فائدہ ہوگا اور کچھ کام کاج کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ رشید بیوی بچے کو ساتھ لے کر مالی کے کھیتوں پر اُٹھ آیا۔ اب وہ اس فکر میں تھا کہ کوئی ساجھی مل جائے اور بیل خرید کر کام شروع کر دیا جائے، کبھی دوسرے تیسرے وہ اسی غرض سے گاؤں میں بھی آ جاتا۔ لیکن ابھی کسی سے سودا نہیں ہوا تھا، یہاں دونوں کو آئے کوئی بیس ایک روز ہوئے تھے کہ ایک رات چور آ گئے، انہوں نے آتے ہی رشید کی مشکیں باندھ لیں اور جھونپڑی کی

تلاشی لینے لگے، یہی گھر کے دو چار برتن اور کپڑوں کے چند جوڑوں کے سوا وہاں رکھا ہی کیا تھا۔ لیکن انہیں تو نقدی کی تلاش تھی ظالم غریب رشید کو مارنے لگے کہ بتا نقدی کہاں ہے۔ اس نے کہا کہ ہم غریب لوگ ہیں، ہمارے پاس روپیہ پیسہ کہاں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اگر پیسہ دھیلا پاس نہ تھا تو بیل خریدنے کیوں گاؤں میں جایا کرتا تھا۔ شوہر کو مصیبت میں دیکھ کر رشیدہ نے روپے نکال کر اُن کے حوالے کئے، ظالموں نے گھر میں جھاڑ دیکھ دی۔ ایک رشید کا پھٹا پرانا کوٹ کہیں کونے میں پڑا رہ گیا رشید اگلے روز مالی کے پاس گیا۔ دونوں نے مل کر پولیس میں رپورٹ لکھوائی لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔

صبر کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ گذر کیسے ہوگی۔ خدا بھلا کرے اس مالی کا۔ اس نے پانچ سات روپے بطور قرض دیئے اور وعدہ کیا کہ وہ بیل وغیرہ کا انتظام بھی کر دے گا۔ رشید کا خیال تھا کہ پھر کارخانے میں جاکر ملازمت کے لیے کسی سے کہے سُنے، لیکن اسے بخار آنے لگا ساتھ ہی کھانسی نے بھی آ دبوچا۔ سینے سے خون بھی آتا۔ رشیدہ شہر آتی اور خیراتی ہسپتال سے شوہر کے لئے دوا لے جاتی لیکن موت کا کیا علاج۔ رشید پانچویں روز ان دکھوں سے چھوٹ گیا۔

مرصینہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"تو جناب!" وہ دوپٹے سے آنکھیں خشک کر کے بولی "دیکھ لئے آپ نے قدرت کے کھیل، وہ لڑکی جو کبھی سونے میں کھیلا کرتی۔ اس کے شوہر کو گھر سے کفن تک بھی نصیب نہ ہوا، اور اب وہ کم بخت رشیدہ اکیلی رہ گئی۔ اب اس کی صرف ایک ہی تمنا تھی کہ جب اس کا وقت ہو چکے تو کوئی اللہ والا اس کے شوہر کا وہی پھٹا پرانا کوٹ اس کے ساتھ ہی دفن کر دے۔"

"بہت دردناک قصہ ہے۔" میں نے کہا۔ "بچہ کہاں ہے؟"

"بچے کو تو گھر والے آنکھ سے اوجھل ہی نہیں ہونے دیتے" سید صاحب نے جواب دیا۔

میں نے ایک آہ بھر کر کہا سچ ہے۔ ؎

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستمگر کا ستم انصاف کی تفسیر ہے

"ہو گئے قائل!" سید صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"بیشک!" میں نے جواب دیا۔

تمت

مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس دہلی۔ سنہ ۱۹۲۲ (زوری)

سُہَاگن

سہاگن حضرت ایم اسلم کے اُن پاکیزہ اور دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں بیشتر افسانے عورتوں سے متعلق ہیں۔

سماج کے گھناؤنے اور رِستے ہوئے ناسوروں میں اصلاحی نشتروں کی تڑپ۔ مصنوعی زندگی اور نمائشی طور طریق کی عریانیاں۔ جدید و قدیم تہذیبوں کی سبق آموز ٹکریں۔ محبّت کا حقیقی اور بلند معیار —— موجودہ فیشن زدہ دور کی خوبیاں اور نقائص اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ——

سُہاگن پڑھیے

اور اپنے مخلصوں میں سہاگن بطور تحفہ دے کر

ہندوستانی کلچر کو تقویت دیجئے

قیمت مجلّد (عہ/)

نگارستان ایجنسی اُردو بازار دہلی

Date	No.	Date	No.